قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

رواہ البخاری

سلسلہ

التبلیغ

کا

سینتیسواں ۳۷ وعظ مسمّٰی بہ

ذم النسیان

منجملہ ارشادات حضرت قبلہ وکعبہ حکیم الامت مولانا مولوی شاہ محمد اشرف علی صاحب دام ظلہم

باہتمام ناظم صاحب امداد المواعظ تھانہ بھون

بابتہ ماہ ربیع الاول ۱۳۴۳ھ

(آرمی پریس بمو دہلی میں طبع ہوئی)

الوعظ الملقب بہ (ذمّ النسیان)

اینَ	کہاں ہوا	جامع مسجد تھانہ بھون
متیٰ	کب ہوا	۱۶ ربیع الثانی ۱۳۳۱ھ بعد نماز عشا عہ
کم	کتنی دیر ہوا	دو گھنٹہ ۱۸ منٹ۔
کیف	کس طرح ہوا	اکثر جمعہ کے دن اس زمانہ میں بیان ہوا کرتا تھا۔
لِمَ	کیوں ہوا	بیٹھکر بیان فرمایا۔
ماذا	کیا مضمون تھا	معاصی کا سبب نسیان ہے اور اس کا علاج ذکر اللہ ہے اور ذکر اللہ کے اقسام چند ہیں۔
من ای شان	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا	سب مسلمانوں کو عموماً اور طبقۂ ذاکرین کو خصوصاً
من ضبط	کس نے ضبط کیا	مسودۂ اجمالی مولانا مولوی سعید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا اور اس کی تفصیل ان کے برادر خورد ظفر احمد عفا اللہ عنہ نے کی
الاشتات	متفرقات	غالباً یہ وعظ برادرم مرحوم کا آخری قلمبند کیا ہوا ہے کیونکہ شروع جمادی الاولی ۱۳۳۱ھ میں ان کا انتقال ہو گیا ناظرین ان کو دعاء خیر میں یاد رکھیں حقیقت میں ضبط مواعظ کا کام وہ سب سے اچھا کرتے تھے اور یہ فیض ان کا ان شاء اللہ تا ابد جاری رہے گا اللہ تعالیٰ ان کو درجات عالیہ جنت میں عطا فرمائیں و رضی عنہ وارضاہ اور ہم پسماندگان کو اپنی مرضیات کی توفیق عطا فرمائیں آمین ۱۲ ظفر۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ وبارک وسلم۔ اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ ولا تکونوا کالذین نسوا اللہ فانسٰھم انفسھم اولٰئک ھم الفاسقون ٭

یہ ایک مختصر سی آیت ہے۔ سورۂ حشر کے آخر کی جس میں مثل دوسری آیتوں کے ایک نہایت ضروری مضمون مذکور ہے۔ اور میں نے تشبیہ کا صیغہ اس لئے استعمال کر دیا تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ کچھ اسی آیت کی تخصیص نہیں بلکہ قرآن کی تمام آیات کی یہی شان ہے۔ کہ ہر آیت میں ضروری ہی مضمون ہے۔ اگر میں تشبیہ کا ذکر نہ کرتا تو ممکن تھا کسی کو یہ شبہ ہوتا کہ شاید دوسری آیتوں میں ضروری مضمون نہیں۔ بس خاص اسی آیت میں یہ بات ہے۔ گو اس شبہ کی کوئی معقول وجہ نہ تھی۔ کیونکہ تخصیص ذکری سے تخصیص حکمی لازم نہیں آتی۔ مگر شاید کسی کو بلاوجہ ہی شبہ پڑتا۔ اس لئے میں نے تشبیہ کے صیغہ سے پہلے ہی دفع دخل مقدر کر دیا

عہ۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس وعظ کی تسوید تفصیلی بھی ماہ ربیع الثانی میں ہوا ہے مگر بجائے ۱۶ تاریخ کے آج ۱۹ تاریخ ہے اور بجائے جمعہ کے پیر کا دن ہے اور بجائے ۱۳۳۱ھ کے ۱۳۳۵ھ ہے ۱۲ ظفر۔

کہ اس آیت میں بھی ایک نہایت ضروری مضمون ہے جیساکہ دوسری آیتوں کی بھی یہی شان ہے۔ قرآن کا تو ہر ہر جزو ضروری ہے۔ اس میں غیر ضروری کوئی بات بھی نہیں حتیٰ کہ جن آیات میں واجبات و فرائض کا بھی ذکر نہیں محض مستحبات ہی کا ذکر ہے۔ مضمون اُن کا بھی ضروری ہے۔ گو آج کل مستحبات کو ضروری نہیں سمجھا جاتا اور عمل کے درجے میں وہ واجبات و فرائض کے برابر ضروری ہیں بھی نہیں مگر تعلیم اُن کی بھی ضروری ہے (دو وجہ سے ایک اس لئے کہ لوگوں کو اُن کا مستحب ہونا معلوم ہو جائے گا تو کوئی اُن کو ناجائز نہ سمجھے گا یا فرض و واجب نہ خیال کرے گا۔ یہ تو اصلاح اعتقاد کے لحاظ سے ضرورت ہے۔ اور اس درجے میں مباحات کی تعلیم بھی ضروری ہے دوسرے) اس لیئے کہ اُن کی برکات اور ثمرات بے شمار ہیں جن پر مطلع ہونا ہی اُن سے بے رغبتی کا باعث ہے اگر اُن برکات و ثمرات کی اطلاع ہو جائے جو ادنیٰ ادنیٰ مستحبات سے حاصل ہوتے ہیں تو آپ خود کہیں گے کہ افسوس ہم اب تک بڑے خسارہ میں تھے۔ جو ایسے قیمتی جواہرات سے بے خبر رہے (یہ ضرورت تکمیلِ عمل کے درجے میں ہے) غرض مستحبات کا ذکر بھی قرآن میں بے ضرورت نہیں بلکہ تعلیم کے درجے میں اُن کا ذکر بھی ضروری اور بہت ضروری ہے اگر محبت ہو تو اُس کی قدر ہو۔ عاشق کا مذاق یہ ہوتا ہے کہ وہ محبوب کی خوشی کی ذرا ذرا سی بات کی تلاش میں رہتا ہے۔ اور جب اُس کو معلوم ہو جاتا ہے کہ محبوب فلاں فلاں بات سے خوش ہوتا ہے۔ تو وہ کوشش کرتا ہے کہ یہ بھی کر لوں وہ بھی کر لوں اور کوئی بات اُس کے خوش کرنے کی مجھ سے رہ نہ جائے۔ اگر ہم لوگوں کو یہ مذاق عاشقانہ نصیب ہو جائے تو اُس وقت ان مستحبات کی قدر معلوم ہو اور ان کے بیان کو خداوند تعالیٰ کی رحمت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت سمجھیں گے۔ کہ اللہ و رسول نے کس تفصیل سے اُن باتوں کو بتلا دیا۔ جو اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے والی ہیں اور اگر شریعت میں صرف ضروریات ہی کا بیان ہوتا مستحبات کا ذکر نہ ہوتا تو عشاق کو سخت بے چینی ہوتی کیونکہ قاعدہ ہے۔ کہ عاشق محض ضروریات پر اکتفا نہیں کیا کرتا اُن کو تو وہ اپنا فرض منصبی سمجھتا ہی بلکہ وہ تو یہ چاہتا ہے۔ کہ فرض

منصبی کے علاوہ بھی ہیں۔ کچھ ایسا کام کروں جس سے محبوب کو مجھ پر زیادہ توجہ ہو (دیکھئے ایک نوکر تو وہ ہے جو محض تنخواہ کے لئے کسی خاص کام پر آپ کا ملازم ہے۔ وہ تو یہ چاہے گا کہ فرض منصبی کو ادا کرتا رہوں۔ اس سے زیادہ کی اُس کو خواہش نہ ہوگی اور ایک وہ نوکر ہے۔ جس کو بچپن سے آپ نے پالا پرورش کیا ہے۔ اور اُس کو آپ کے ساتھ جاں نثاری کا تعلق ہے۔ وہ ہرگز فرض منصبی پر اکتفا نہ کرے گا بلکہ وہ اس کی کوشش کرے گا۔ کہ آقا کے خوش کرنے کا جو کام بھی ہو وہ میرے ہاتھ سے ہو جائے۔ وہ اپنے خاص کام کے علاوہ رات کو آپ کے پیر بھی دباتے گا۔ پنکھا بھی جھلے گا۔ اور آپ کے جاگنے سے پہلے تمام ضروریات کے مہیا کرنے کا سامان کرے گا۔ اور یہ کبھی خیال نہ کرے گا کہ یہ کام تو میرے فرض منصبی سے زیادہ ہیں انہیں کیوں کروں نہیں بلکہ اُس کی محبت اور جاں نثاری مجبور کرے گی کہ جس کام سے بھی آقا خوش ہو وہ ضرور کرنا چاہیئے) صاحبو! ہمارا علاقہ حق تعالیٰ شانہ کیساتھ ہمارے خیال فاسد میں محض قانونی رہ گیا ہے۔ اسی لئے ہم واجبات و فرائض کے علاوہ مستحبات کو غیر ضروری سمجھتے ہیں اگر ہم کو حق تعالیٰ کے ساتھ محبت اور جاں نثاری کا علاقہ ہوتا تو فرائض و واجبات پر ہم کبھی اکتفا نہ کرسکتے۔ بلکہ مستحبات کی تلاش میں خود بخود رہتے اور جس بات کے متعلق بھی یہ معلوم ہو جاتا کہ حق تعالیٰ کو یہ پسند ہے وہ اس سے خوش ہوتے ہیں اُس کی طرف شوق سے سبقت کرتے اور جس بات کے متعلق یہ معلوم ہو جاتا کہ یہ حق تعالیٰ کو ناپسند ہے۔ اُس سے کوسوں دُور بھاگتے اور اس کی تحقیق نہ کرتے کہ یہ زیادہ ناپسند ہے یا کم۔ عاشق کو اتنا جان لینا کسی کام سے رکنے کے لئے کافی ہے کہ یہ محبوب کو ناپسند ہے وہ یہ کبھی تفتیش نہیں کرتا کہ یہ ایسا ناپسند ہے۔ کہ اس کی سزا میں ضرب و حبس کی جاتی ہے یا ایسا ناپسند ہے کہ محبوب کسی قدر کبیدہ خاطر ہو جاتا اور رُخ پھیر لیتا ہے۔ اُس کے نزدیک دونوں کام برابر ہیں وہ اس کو بھی ہرگز گوارا نہیں کرسکتا کہ محبوب اُس سے کچھ بھی کبیدہ خاطر یا بے رُخ ہو جائے۔ اور جس کام میں کبیدگی کے علاوہ سزائے ضرب و حبس بھی ہو وہ تو بھلا کیوں ہی کرنے لگا۔ مگر آج کل

ہماری یہ حالت ہے۔ کہ اگر کسی کام کی نسبت یہ معلوم ہو جائے کہ یہ گناہ ہے۔ تو سوال ہوتا ہے کہ کیا بڑا گناہ ہے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ اگر چھوٹا گناہ ہوا تو کر لیں گے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہمارا تعلق حق تعالیٰ کے ساتھ بہت ضعیف ہو گیا ہے۔ گو پوری بے تعلقی بھی نہیں ہے۔ کیونکہ یہ سوال ہی تعلق کی دلیل ہے۔ میں ان لوگوں کی طرفداری کرتا ہوں کہ ان کو خدا تعالیٰ سے بالکل بے تعلق نہ سمجھا جائے۔ کیونکہ اُن کو اتنا تعلق تو ہے۔ کہ وہ حق تعالیٰ کو زیادہ ناراض کرنا پسند نہیں کرتے اگر اتنا بھی تعلق نہ ہوتا تو اس سوال ہی کی کیا ضرورت تھی کہ کیا بڑا گناہ ہے۔ معلوم ہوا کہ بڑے گناہ سے ڈرتے ہیں۔ کیونکہ اس سے خدا تعالیٰ بہت ناراض ہوتے ہیں لیکن زیادہ تعلق نہیں ہے۔ اس لئے تھوڑا سا ناراض کر دینا گوارا ہے۔ غرض یہی سوال تعلق کی بھی دلیل ہے اور ضعف تعلق کی بھی۔ اس تقریر سے وہ لوگ خوش ہوئے ہونگے جو گناہ کے متعلق بڑا چھوٹا ہونے کا سوال کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ کے ساتھ ہمارا تعلق بھی ثابت ہو گیا اور یہ بات ایک درجے میں ہے بھی خوش ہونے کی۔ کیونکہ بلا بود ے اگر ایں ہم نبودے۔ مگر وہ یاد رکھیں کہ نفس تعلق پر قناعت نہیں ہو سکتی۔ آخر آپس میں جو ایک دوسرے سے ہم تعلقات رکھتے ہیں کیا اُن میں نفس تعلق پر کوئی شخص قناعت کر سکتا ہے ہرگز نہیں بلکہ ہر تعلق کا درجہ کمال ہر شخص کو مطلوب ہے۔ دیکھئے بیوی کے ساتھ جو ارتباط ہے۔ حالانکہ وہ ایک نہایت ہی ضعیف تعلق ہے۔ جو صرف دو لفظوں سے جڑ جاتا اور ایک لفظ سے ٹوٹ جاتا ہے۔ مگر اس میں ہم نے کسی کو نہیں دیکھا جو نفس تعلق پر قناعت کرتا ہو۔ بلکہ ہر شخص کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ بیوی کو میرے ساتھ کامل تعلق ہو اسی لئے محض حقوق ضروریہ پر اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ اُس کے خوش کرنے کے لئے وہ وہ کام کئے جاتے ہیں۔ اور وہ زیور اور لباس تیار کئے جاتے ہیں جو اُس کا حق نہیں مگر محض اپنے مصلحت کی وجہ سے اُن کاموں کو کیا جاتا ہے۔ تاکہ یہ تعلق بڑھے اور مستحکم ہو اگر مرد بیوی کے ساتھ یا بیوی مرد کے ساتھ قانونی علاقہ رکھے اور حقوق ضروریہ سے زیادہ کچھ نہ کرے تو گو نفس تعلق باقی رہ سکتا ہے۔ مگر تعلق کا لطف حاصل نہیں ہوتا اور اس صورت میں ہر وقت قطع تعلق کا اندیشہ

رہتا ہے۔ تعلق کو بقا جب ہی ہوتی ہے۔ کہ اُس کے استحکام کی تدبیر کی جائے۔ چنانچہ مرد کے ذمے بیوی کا محض کھانا کپڑا ضروری ہے۔ زیور اور ریشمی لباس لازم نہیں نہ اُس کی دوا دارو لازم ہے۔ نہ اُس کے کنبے والوں کی دعوت ضیافت ضروری ہے۔ مگر محض تعلق بڑھانے کے لئے یہ سب کچھ کیا جاتا ہے۔ اور اُس کے جی خوش کرنے کو ہر کام میں ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ حالانکہ اوپر معلوم ہو چکا کہ یہ تعلق نہایت ہی ضعیف ہے مگر باوجود اس ضعف کے اس کا منقطع ہو جانا ہر شخص کو ناگوار ہے۔ اور اگر کبھی منقطع ہو جاتا ہے۔ تو کتنا رنج ہوتا ہے۔ اور انقطاع سے بچنے ہی کے لیئے اُس کے استحکام کے اسباب اختیار کیے جاتے ہیں۔ پھر کس قدر حیرت کی بات ہے۔ کہ ہم کو ایک ضعیف تعلق میں تو نفس تعلق پر قناعت نہ ہو بلکہ خوف انقطاع سے اُس کے استحکام کی فکر ہو۔ اور حق تعالیٰ کے ساتھ نفس تعلق پر اکتفا گوارا ہو حالانکہ خدا تعالیٰ سے ہمارا ایسا قوی علاقہ ہے۔ کہ اُس کی برابر کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اُس کے استحکام کی ہم کو فکر نہیں اور محض نفس تعلق کو کافی سمجھ رکھا ہے۔ اور یہاں وہ خیال کیوں نہیں کیا جاتا کہ تعلق کا بقا استحکام پر موقوف ہے۔ نفس تعلق بقا کے لئے کافی نہیں بلکہ اس میں زوال و انقطاع کا خطرہ لگا ہوا ہے۔ تو کیا کوئی اس بات کو گوارا کر سکتا ہے۔ کہ حق تعالیٰ کے ساتھ جو اس کا علاقہ ہے وہ منقطع ہو جائے ہرگز نہیں پھر اُس کے استحکام کا کیوں خیال نہیں کیا جاتا مولانا فرماتے ہیں

ایکہ صبرت نیست از فرزند و زن | صبر چوں داری ز رب ذوالمنن
ایکہ صبرت نیست از دنیائے دون | صبر چوں داری زنعم الماھدون

ہائے ہائے ہمیں چھوٹی چھوٹی چیزوں سے تو صبر نہیں ہو سکتا۔ مگر نہ معلوم خدا تعالیٰ سے لوگوں کو کیسے صبر آ گیا۔ ادنیٰ ادنیٰ چیزوں کے ساتھ ضعف تعلق ہم کو گوارا نہیں اور خدا تعالیٰ کے ساتھ تعلق ضعیف ہونے پر ذرا جی نہیں دُکھتا۔ گو حق تعالیٰ کے ساتھ نفس تعلق بھی ایک نعمت ہے۔ مگر ضعف تعلق پر قناعت کر لینا بھی بڑا ظلم ہے۔ بعض لوگ تو بے تعلقی ہی پر راضی ہیں یہ تو کفار ہیں ان سے اسوقت خطاب نہیں۔ اور بعض لوگ ضعف تعلق پر راضی ہیں۔ یہ ہم آج کل کے مسلمان ہیں حیرت ہے کہ ہم کو خدا تعالیٰ کیساتھ

ضعیف تعلق رکھنے پر صبر کیسے آتا ہے۔ اُسی کا یہ اثر ہے کہ آج کل ہم کو مستحب کی قدر نہیں اور
اُن کو غیر ضروری سمجھا جاتا ہے۔ میں اپنی کہتا ہوں کہ بچپن میں بہت سے نوافل کا پابند تھا
مگر منیۃ المصلی پڑھتے ہی جب معلوم ہوا کہ یہ تو مستحبات ہیں جن کے نہ کرنے میں کچھ گناہ
نہیں۔ اُسی وقت سے نوافل کو چھوڑ دیا۔ اس وقت تو تنبہ نہ ہوا کہ میں کیا کر رہا ہوں
مگر اب معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ حالت بہت بُری تھی۔ اس کا تو یہی حاصل ہوا کہ ہم حق تعالیٰ
کے ساتھ ضابطہ کا تعلق رکھنا چاہتے ہیں کہ ضروریات کو بجالائیں اور اُن کے علاوہ
جو باتیں خدا تعالیٰ کو خوش کرنے کی ہیں اُن کو نہ بجالائیں تو کیا ہم دُنیا میں اپنے
مربیوں کی ساتھ بھی یہ برتاؤ کر سکتے ہیں۔ کہ خدمت واجبہ کے سوا کچھ نہ کریں ہرگز نہیں
دیکھئے بعض اوقات کسی طمع کی وجہ سے یا محبت کی وجہ سے ہم اپنے مربیوں کی خدمت
غیر واجبہ بھی بہت کچھ کرتے ہیں تو کیا خدا تعالیٰ کا اتنا بھی حق نہیں جتنا مربیوں اور
بزرگوں کا حق ہوا کرتا ہے۔ ذرا کچھ تو انصاف سے کام لینا چاہیئے۔ پھر یہ کیا بات ہے
کہ ہم حق تعالیٰ کی طاعت میں اُسی قدر پر اکتفا کرتے ہیں جو فرض و واجب ہے۔ اور طاعت
غیر واجبہ کو کسی درجے میں بھی ضروری نہیں سمجھتے۔ یہ ضرور ہے کہ خدا تعالیٰ کی شان
کے لائق ہم سے اُسکی طاعت کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ اور ہم جتنا بھی کچھ کریں وہ اُسکے
حق کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔ اور یہ بھی ایک سبب ہے مستحبات میں ہماری کوتاہی
کا کیونکہ اس سے ہم کو یہ دہوکہ ہو گیا ہے۔ کہ جب حق ادا ہو ہی نہیں سکتا تو پھر کس لیئے
زیادہ کوشش کریں مگر یہ سخت غلطی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہم اُسکی شان کے
موافق عمل نہیں کر سکتے مگر اپنے مقتضائے حال کے موافق تو کر سکتے ہیں (دُنیا میں رات
دن دیکھا جاتا ہے۔ کہ لوگ سلاطین کے سامنے ہدایا و تحائف لیجاتے ہیں اور جانتے
ہیں کہ بادشاہ کی شان کے موافق ہمارا ہدیہ نہیں ہو سکتا مگر اُس کا یہ اثر کبھی نہیں
ہوتا کہ ہدیہ دینا ہی موقوف کر دیں۔ بلکہ جتنا اپنے سے بن پڑتا ہے کوشش کر کے عمدہ
سے عمدہ ہدیہ پیش ہی کرتے ہیں اسی لئے مثل مشہور ہے کہ ہدیہ یا تو دوسرے کی
شان کے موافق ہو یا کم از کم اپنی ہی شان کے موافق ہو ۱۲) پس ہم کو اپنی ہمت اور طاقت

کے موافق تو عمل کرنا چاہیئے۔ اور میں اطمینان دلاتا ہوں کہ حق تعالیٰ کو راضی کرنیکے لئے اتنا ہی
عمل کافی ہے جتنا آپ کر سکتے ہیں آپ اپنی طاقت سے زیادہ نہ کیجئے حق تعالیٰ نے بندہ
کو اسکا مکلف نہیں کیا کہ وہ حق تعالیٰ کی شان کے موافق عمل کرے بلکہ اسی قدر کا مکلف
کیا ہے کہ وہ اپنی طاقت وہمت کے موافق عمل کرے تو اب یہ کتنی بڑی غلطی ہے۔ کہ ہم
مستحبات کو اس لئے ترک کردیں کہ حق تعالیٰ کا حق تو ادا ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ اور بات
ہے کہ کسی وقت مستحب کو کسی مصلحت شرعی کیوجہ سے ترک کردیا جائے (مثلاً لوگوں
کو یہ بتلانے کے لئے کہ یہ فعل واجب نہیں یا سفر میں رفقاء کی رعایت سے نوافل
وغیرہ کو چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ انتظار سے پریشان نہوں ۱۲) یا کسی وقت تعب کی
وجہ سے اپنی راحت کے لئے ترک کردیا جائے۔ کہ شرعاً اس وقت ترک مستحبات پر ملامت
نہیں۔ چنانچہ راحت حاصل کرنیکے لئے تو حدیث میں وارد ہے۔ ان لنفسك عليك حقا و
ان لعينك عليك حقا الخ مگر بلاوجہ ترک کرنا اس سے حدیث میں پناہ آئی ہے۔
کیونکہ یہ سستی اور کاہلی ہے جس کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اللھم
انی اعوذ بك من العجز والکسل خوب سمجھ لیجئے کہ طلب راحت اور چیز ہے۔ اور سستی اور چیز ہے
دونوں کو ایک سمجھنا غلطی ہے۔ طلب راحت کا تو حضور نے امر فرمایا ہے۔ اور اس کے
لئے بعض صحابہ کو ترک مستحبات وتقلیل نوافل کی ترغیب دی ہے۔ اور سستی سے آپ نے
پناہ مانگی ہے (اب سمجھئے کہ طلب راحت اور سستی میں کیا فرق ہے۔ طلب راحت اس
وقت ہوا کرتی ہے جب آدمی اپنی طاقت کے موافق کام کرچکا ہو اس کو حکم ہے کہ
بس طاقت سے زیادہ نہ کرو جاکر آرام کرو۔ اور سستی یہ ہے کہ اپنی طاقت وہمت کے
موافق بھی کام نہ کرے بلکہ تھوڑا سا کرکے عمل کو چھوڑ دے اس سے پناہ آئی ہے ۱۲)
غرض خدا تعالیٰ کے ساتھ ہمارا بڑا تعلق ہے۔ اسکے لحاظ سے مستحبات بھی ضروری ہیں
یہ میں اس شبہ کا جواب دے رہا ہوں جو میرے اس قول پر ہوا تھا کہ خدا تعالیٰ کے
کام کا ہر ہر جزو ضروری ہے۔ چونکہ قرآن میں مستحبات کا بھی ذکر ہے۔ اور ان کو غیر ضروری خیال
سمجھا جاتا ہے۔ تو میں نے بتلا دیا کہ تعلیم ان کی بھی ضروری ہے۔ کیونکہ ان کے برکات

وثمرات بیشمار ہیں چنانچہ ایک برکت تو یہ ہے کہ بعض اوقات مستحبات معصیت سے مانع ہوجاتے ہیں (کیونکہ جو شخص تہجد و اشراق کا پابند ہوگا وہ بہ نسبت اس شخص کے معاصی سے زیادہ بچے گا جو محض پانچ وقت کے فرائض ہی ادا کرتا ہے۔ اور اس میں علاوہ خاصیت کے ایک طبعی راز یہ ہے کہ مستحبات کی پابندی سے یہ شخص زمیندار تہجد گزار مشہور ہوجاتا ہے تو اس لقب کے ساتھ گناہوں کے ارتکاب سے وہ خود بھی شرمانے لگتا ہے ۱۲) اور بعض اوقات کوئی فعل مستحب حق تعالیٰ کو ایسا پسند آجاتا ہے کہ وہی نجات کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ چنانچہ سیبویہ ایک نحوی ہے۔ جو عقیدے کے لحاظ سے معتزلی ہے۔ اور عقائد فاسدہ پر سخت عذاب نار کا استحقاق ہوتا ہے۔ مگر مرنے کے بعد اُن کو کسی نے خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ خدا تعالیٰ نے تمہاری ساتھ کیا معاملہ فرمایا کہا مجھے بخشدیا پوچھا کس بات پر بخشدیا کہا ایک نحو کے مسئلہ پر میری نجات ہوگئی وہ مسئلہ یہ ہے کہ معرفہ کی بحث میں نحاۃ نے اختلاف کیا ہے کہ اعرف المعارف کون ہے۔ کسی نے ضمیر متکلم کو اعرف المعارف کہا کسی نے ضمیر مخاطب کو میں نے یہ کہا کہ لفظ اللہ اعرف المعارف ہے۔ اس سے بڑھکر کوئی معرفہ متعین نہیں کیونکہ لفظ اللہ میں بجز ذات حق کے کسی کا احتمال ہی نہیں۔ حق تعالیٰ نے اس بات پر فرمایا کہ تم نے ہمارے نام کی بہت تعظیم کی۔ جاؤ تم کو بخش دیا۔ دیکھئے اس نحوی کی مغفرت ایسے عمل مستحب پر کی گئی جو اُس نے بہ نیت ثواب بھی نہ کیا تھا بلکہ مسئلہ نحو کے طور پر ایک بات کہی تھی۔ مگر اسی پر فضل ہوگیا۔ اور باوجود فساد عقیدہ اور استحقاق نار کے بخشدیا گیا۔ اسی طرح ایک بزرگ جاڑے کی رات میں چلے جا رہے تھے۔ راستے میں ایک بلّی کا بچہ دیکھا جو سردی میں ٹھٹھر رہا تھا اُن کو رحم آیا اور اسے گود میں اٹھا کر گھر لائے اور لحاف میں چھپالیا۔ جب انتقال ہوگیا تو پوچھا گیا۔ بتلاؤ ہمارے واسطے کیا لائے اُنہوں نے بہت سوچ ساچکر یہ خیال کیا کہ اور اعمال تو میرے کسی قابل ہیں نہیں اُن کو تو کیا پیش کروں لیکن الحمدللہ مجھے ایمان کی دولت حاصل ہے۔ اس میں ریاء وغیرہ بھی کچھ نہیں ہوسکتا۔ بس ایمان کو پیش کرنا چاہیئے۔ اسلئے عرض کیا کہ میں توحید لایا ہوں

وہاں سے اعتراض ہوا! تذکر لیلۃ اللبن ، یعنی وہ دودھ والی رات بھی یاد ہے اس میں
ایک واقعہ کی طرف اشارہ تھا کہ ایک رات ان بزرگ نے دودھ پیا تھا اس کے بعد پیٹ
میں درد ہوگیا صبح کو ان کے منہ سے یہ بات نکل گئی کہ رات دودھ پیا تھا اس سے پیٹ
میں درد ہوگیا حق تعالیٰ نے اس واقعہ کو یاد دلا کر توحید پر گرفت فرمائی کہ یہی توحید کا
دعویٰ ہے کہ ہم کو چھوڑ کر تم نے دودھ کو مؤثر کہا۔ اور درد کے فعل کو اسکی طرف منسوب کیا
اتبو یہ بیچارے تھرا اُٹھے۔ پھر ارشاد ہوا کہ تم نے اپنے دعویٰ کی حقیقت تو دیکھ لی تو اب
ہم تمکو ایک ایسے عمل پر بخشتے ہیں جسکی بابت تمکو یہ وہم بھی نہ تھا کہ یہ موجب نجات ہوجاے گا
تم نے ایک رات ایک بلی کے بچے کو جو سردی میں مر رہا تھا اپنے لحاف میں سُلایا تھا اس
نے تمہارے حق میں دعا کی تھی۔ جو ہم نے قبول کرلی۔ جاؤ آج اس بلی کے بچے کی دعا پر
تم کو بخشتے ہیں تم نے ہماری ایک مخلوق پر رحم کیا تھا تو ہم اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ تم پر
رحم کریں تو صاحبو! مستحبات میں یہ عنایات و برکات ہوتی ہیں احادیث میں ایسے بہت
واقعات آئے ہیں کہ بعض لوگوں کی ایک ادنیٰ فعل مستحب پر مغفرت ہوگئی چنانچہ ایک
فاحشہ عورت کا قصہ حدیث میں آتا ہے کہ اس نے گرمی کے دوپہر میں ایک کتے کو دیکھا
جو پیاس کے مارے زمین کی تر مٹی چاٹ رہا تھا۔ اس کو رحم آیا اور پاس ہی ایک کنواں
تھا اس سے پانی نکال کر کتے کو پلانا چاہا مگر دیکھا تو کنویں پر ڈول ہے نہ رسی۔ اب وہ سوچنے
لگی کہ پانی کیوں کر نکالوں مثل مشہور ہے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے آخر اس نے
ایک ترکیب نکالی وہ یہ کہ اپنی اوڑھنی کو تو رسی بنایا اور پیر میں چمڑے کا موزہ تھا اُسے
ڈول بنایا اس طرح پانی نکال کر کتے کو پلایا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد اس کا انتقال ہوگیا
اُس فاحشہ کی مغفرت اس عمل پر ہوگئی۔ دیکھئے ساری عمر تو سیہ کاری میں گزاری اور ایک
ذرا سے عمل مستحب پر مغفرت ہوگئی۔ (واقعی سچ ہے ؎

رحمتِ حق بہانہ می جوید — رحمتِ حق بہا نمی جوید

اسلئے کسی عمل کو حقیر نہ سمجھو نہ معلوم کون سا کام اُن کو پسند آجائے ۱۲) مگر اس کے یہ معنے
نہیں ہیں کہ رحمت پر بھروسہ کرکے عمل ہی چھوڑ دو۔ آج کل اس مذاق کے لوگ بھی ہیں جنہیں

واقعات رحمت کے سننے سے یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ عمل کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے بات یہ ہے کہ ان حکایات کی مثال بارش جیسی ہے اور ہی کیا جتنی بھی نصوص ہیں سب کی یہی مثال ہے تو بارش فی نفسہ نہایت لطیف اور روح پرور ہے مگر اُس کا اثر ہر محل کی قابلیت وعام قابلیت کے مناسب جدا ہوتا ہے۔ اگر عمدہ زمین ہے تو بارش سے اُس میں پھول پھلواری اور عمدہ پھل پیدا ہونگے اور اگر شور زمین ہے تو اُس میں جتنی بارش ہوگی اُتنے ہی کانٹے اور جھاڑ جھنکاڑ پیدا ہوں گے شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

باران کہ در لطافت طبعش خلاف نیست
در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

اسیطرح واقعات رحمت کو سنکر دو اثر ہوتے ہیں جو لوگ علیل المزاج ہیں وہ تو سمجھتے ہیں کہ جب حق تعالیٰ ایک ذرا سے نکتہ پر بخش دیتے ہیں تو عمل صالح کی کیا ضرورت ہے اور جو شریف المزاج ہیں وہ اس کو سنکر پہلے سے زیادہ اطاعت پر گرتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

تصدق اپنے خدا کے جاؤں یہ پیار آتا ہے مجھکو اثنا
ادہر سے ایسے گناہ پیہم اُدھر سے وہ دمبدم عنایت

بلکہ میں ایک نئی بات کہتا ہوں کہ بعض اوقات بدون سزا کے معافی دیدینے پر اہلِ دل اس قدر شرمندہ ہوتے ہیں کہ کچھ سزا مل جاتی تو اتنے شرمندہ نہ ہوتے سزا مل جانے پر تو کچھ شرمندگی کم ہو جاتی مگر سنگین جرم کو ویسے ہی معاف کر دینا تو گویا اُن کو ذبح کر دینا ہے۔ اب تو مارے ندامت کے وہ زمین میں گڑ جاتے ہیں۔ یہ ایک حالت ہے جس پر گزرتی ہے۔ وہی اس کو سمجھ سکتا ہے اور جس نے اس حالت کو بچھا ہوگا وہ اس آیت کی تفسیر بے تکلف سمجھ لیگا۔ فاثابکم غما بغم لکیلا تحزنوا علی مافاتکم اس کا قصہ یہ ہے۔ کہ جنگ احد میں بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے ایک غلطی ہوگئی تھی وہ یہ کہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ شروع ہونے سے پہلے جب لشکر کی صف بندی فرمائی تو پچاس آدمیوں کو پہاڑ کی ایک گھاٹی پر متعین فرمایا اور اُن سے ارشاد فرمایا کہ تم یہاں سے بدون میری اجازت کے ہرگز نہ ہٹنا خواہ ہمارے اوپر کچھ ہی حالت گزر جائے۔ اس گھاٹی کی اس قدر حفاظت کی یہ ضرورت تھی کہ اس راستے سے دشمن کے آجانے کا اندیشہ تھا اور یہ گھاٹی

لشکر اسلام کی پشت پر تھی۔ اگر دشمن کی فوج کا ایک دستہ ادھر سے آجاتا اور ایک دستہ مقابل ہوکر لڑتا تو مسلمان بیچ میں گھر جاتے اور ظاہر ہے کہ آگے پیچھے دونوں طرف سے لشکر کا گھر جانا سخت خطرناک ہے۔ اس لئے حضور نے صف بندی کرتے ہوئے اس گھاٹی پر ایک جماعت کو تاکید کے ساتھ متعین فرمایا خداتعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قوت انتظام بھی ایسی عطا فرمائی تھی کہ غیر اقوام بھی اس کو تسلیم کرتی ہیں حتی کہ وہ تو اشاعت اسلام کو حضور کی قوت عقلیہ ہی کا نتیجہ سمجھتے ہیں تو وہ ہم سے بھی زیادہ حضور کی قوت عقلیہ کے معتقد ہوئے کہ جس چیز کو ہم امداد غیبی کا نتیجہ سمجھتے ہیں وہ اسکو بھی حضور کی قوت عقلیہ پر محمول کرتے ہیں۔ اس انتظام کے بعد حضور نے لشکر اسلام کو حملے کی اجازت دی اور الحمدللہ تھوڑی ہی دیر میں مسلمانوں کو کھلی فتح حاصل ہوئی کہ ابوسفیان بن حرب جو اس وقت لشکر کفار کے سردار تھے مع لشکر کے بھاگ پڑے اور جھنڈا بھی گر پڑا (١٣) حضرت ابوسفیان کی بیوی ھندہ بنت عتبہ بھی بھاگیں اور بھاگتے ہوئے اُن کے خلخال اور پنڈلیاں تک کھل گئیں غرض کفار کو شکست فاش ہوئی اور مسلمان اُن کے تعاقب میں دوڑے اب ان پچاس آدمیوں میں اختلاف ہوا جو گھاٹی پر متعین تھے بعض نے کہا کہ ہمارے بھائیوں کو فتح حاصل ہوگئی ہے اب ہم کو گھاٹی پر رہنے کی ضرورت نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس غرض کیلئے ہم کو یہاں متعین فرمایا تھا وہ غرض حاصل ہو چکی اسلئے حکم قرار بھی ختم ہوگیا۔ اب یہاں سے ہٹنے میں حضور کے مقصود کی مخالفت نہ ہوگی اور ہم نے اب تک جنگ میں کچھ نہیں لیا تو کچھ ہم کو بھی کرنا چاہیئے۔ ہمارے بھائی کفار کا تعاقب کر رہے ہیں ہم کو مال غنیمت جمع کر لینا چاہیئے بعض نے اس رائے کی مخالفت کی اور کہا کہ حضور نے صاف فرمادیا تھا کہ بدون میری اجازت کے یہاں سے نہ ہٹنا اسلئے ہمکو بدون آپ کی اجازت کے ہرگز کچھ نہ کرنا چاہیئے مگر پہلی رائے والوں نے نہ مانا اور چالیس آدمی گھاٹی سے ہٹکر

(١٣) لطیفہ اس واقعہ میں کثرت رائے غلطی پر تھی اور قلت رائے صواب پر تھی جو لوگ کثرت رائے کو علامت حق سمجھتے ہیں وہ اس سے سبق حاصل کریں ١٢ منہ

مال غنیمت جمع کرنے میں مشغول ہوگئے یہ اُن سے اجتہادی غلطی ہوئی اور گھاٹی پر صرف دس
آدمی اور ایک اُن کے افسر رہ گئے۔ حضرت خالد بن ولید اس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے
اور اس جنگ میں وہ لشکر کفار کی طرف تھے۔ یہ ہمیشہ سے بڑے مدبر اور جنگ آزمودہ
ہیں۔ انہوں نے اپنے جاسوس چھوڑ رکھے تھے تاکہ اس گھاٹی کی خبر وقتاً فوقتاً اُن کو
پونچاتے رہیں۔ چنانچہ عین اس وقت جبکہ حضرت خالد مع تمام لشکر کفار کے بھاگے
جارہے تھے اُن کے جاسوس نے اطلاع دی کہ اب وہ مورچہ خالی ہے اور بجز دس
گیارہ آدمیوں کے وہاں کوئی نہیں ہے۔ حضرت خالد نے بھاگتے بھاگتے اپنا رخ پلٹا
اور پانچسو جوانوں کو ساتھ لے کر اُس گھاٹی پر پہونچ گئے دس گیارہ صحابی جو وہاں باقی
رہ گئے تھے۔ اُن سے مقابل ہوئے مگر تھوڑی ہی دیر میں سب شہید ہو گئے۔ اور
حضرت خالد نے مسلمانوں کے پیچھے سے آکر اُن پر حملہ کر دیا یہ رنگ دیکھ کر کفار کا باقی لشکر
بھی لوٹ پڑا اور مسلمان آگے پیچھے دونوں طرف سے نرغے میں آگئے۔ اور جس خطرے
کے لئے حضور نے گھاٹی کی حفاظت فرمائی تھی بعض صحابہ کی اجتہادی غلطی سے اُس
خطرے کا سامنا ہوگیا۔ چنانچہ ستّر کے قریب مسلمان شہید ہوئے اور شیطان کی اس
جھوٹی آواز پر کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) قتل ہوگئے۔ بہت سوں کے پیر اُکھڑ گئے۔ اور
جنگ کا نقشہ بالکل پلٹ گیا۔ (یہ سب کچھ ہوا مگر باایں ہمہ مسلمانوں کو شکست نہیں ہوئی
کیونکہ شکست کے معنے یہ ہیں کہ لشکر مع سردار کے بھاگ جائے۔ اور یہاں ایسا
نہیں ہوا۔ کیونکہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مع چند جاں نثاروں کے میدان
میں برابر جمے رہے۔ آپ کبھی نہیں بھاگے اور تھوڑی دیر کے بعد جب حضور نے ایک
صحابی کو حکم دیا کہ بھاگنے والوں کو پکارے تو فوراً میدان میں سب مسلمان آموجود ہوئے
ہاں اتنا ضرور ہوا کہ اس جنگ میں مسلمانوں کو نمایاں فتح حاصل نہیں ہوئی ۱۲ ظ) حق تعالیٰ
نے اس واقعہ میں مسلمانوں پر مصیبت آنے کا سبب اُن صحابہ کی غلطی اجتہادی کو قرار
دیا۔ جو حضور کی اجازت بغیر گھاٹی سے ہٹ گئے تھے۔ چنانچہ ارشاد ہے وعصیتم
من بعد ما اراکم ما تحبون اس کے بعد بطور عتاب کے فرماتے ہیں فاثابکم غما بغم

لکیلا تحزنوا علی ما فاتکم یعنی پھر خدا تعالیٰ نے تم کو بھی غم دیا بدلہ (اُس) غم کے (جو تم نے نافرمانی کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا تھا) اس کے بعد اس انتقام کی حکمت ارشاد فرماتے ہیں لکیلا تحزنوا علی ما فاتکم تاکہ تم کو (انتقام لے لینے کے بعد) اس بات پر (زیادہ) رنج نہ ہو جو تم سے فوت ہو گئی تھی۔ یہ وہی بات ہے۔ جو میں نے ابھی بیان کی تھی کہ بعض شریف طبیعتوں پر خطا کا انتقام نہ لینے سے ندامت زیادہ غالب ہوتی ہے اور انتقام لے لینے سے ندامت کم ہو جاتی ہے۔ اسی بنا پر ارشاد ہے۔ کہ ہم نے تم کو تھوڑی سی مصیبت اس لئے دیدی تاکہ بدون سزا کے معافی دینے سے تم پر ندامت و رنج کا زیادہ غلبہ نہ ہو۔ بعض مفسرین نے اس جگہ لکیلا تحزنوا میں لائے نافیہ کو زائد مانا ہے۔ اُن کو یہ خیال ہوا کہ موقع عتاب کا ہے۔ اور سزا تو رنج دینے ہی کے لئے دی جاتی ہے۔ پھر اس کا کیا مطلب کہ تم کو اس لئے غم دیا تاکہ تم مافات پر رنج نہ کرو اُن کے نزدیک لا کو اپنے معنے پر رکھ کر مطلب نہ بن سکا اس لئے انہوں نے لا کو زائد کہکر یہ مطلب بیان کیا کہ تم کو غم دیا تاکہ تم کو مافات پر رنج ہو۔ مگر جس نے اُس حالت کو سمجھا ہے جو میں نے ابھی بیان کی ہے وہ سمجھے گا کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم خدا و رسول کے عاشق تھے۔ اگر اُن کی خطا بدون کسی انتقام کے معاف کر دی جاتی تو عمر بھر مارے ندامت کے آنکھ نہ اُٹھا سکتے۔ اس لئے اُن کو تھوڑی سی مصیبت دے دی گئی۔ تاکہ زیادہ رنج غالب نہ ہو۔ پس یہ کہنا غلط ہے کہ سزا ہمیشہ رنج دینے ہی کے لئے ہوا کرتی ہے۔ بلکہ بعض دفعہ رنج کم کرنے کے لئے بھی سزا دی جایا کرتی ہے۔ اس حالت پر نظر کر کے تفسیر نہایت صاف ہے۔ اور لا کو زائد کہنے کی کچھ ضرورت نہیں اب بتلایئے جس شخص کی یہ حالت ہو کہ خطا کر کے بدون سزا کے اُسے چین ہی نہ پڑے وہ واقعات رحمت سُنکر گناہوں پر دلیر ہو گا یا غیرت سے زمین میں گڑ جائے گا۔ یقیناً جو لوگ صحیح المزاج ہیں۔ اور جن کو خدا تعالیٰ سے محبت کا تعلق ہے وہ تو واقعات رحمت سُنکر پہلے سے زیادہ اطاعت پر گر پڑیں گے۔ نمک حرام ہے وہ نوکر جس کی خطا بدون سزا کے معاف کر دی جائے۔ تو ناز کرنے لگے اور نافرمانی پر دلیر ہو جائے۔ شریف وہ ہے

جو آقا کی اس عنایت کو دیکھ کر عمر بھر کے لئے گڑ جاتے۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ جن لوگوں کو واقعاتِ رحمت سننے سے یہ ضرر ہوتا ہے۔ کہ وہ عمل میں کوتاہی کرنے لگتے ہیں اُن میں مرض ہے۔ اُن کو اپنی اصلاح کرنا چاہیئے اور حق تعالیٰ کے ساتھ تعلق محبت پیدا کرنا چاہیئے۔ پھر اُن پر مستحبات کے یہ برکات و منافع سنکر اُلٹا اثر نہ ہوگا غرض بعض مستحبات کی بدولت عمر بھر کا دلدر دھل جاتا ہے تو یہ کتنی بڑی رحمت ہے کہ حق تعالیٰ نے ہم کو مستحبات کی تعلیم فرمائی۔ اب وہ شُبہ بالکل جاتا رہا۔ کہ قرآن کا ہر جزو ضروری کہا ہے بلکہ بعض مستحبات بھی ہیں جو غیر ضروری ہیں اس تقریر سے آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا۔ کہ مستحبات بھی تعلیم کے درجے میں تو نہایت ہی ضروری ہیں اور باعتبار ثمرات کے عمل میں بھی ایک گونہ ضروری ہیں۔ اب وہ دعویٰ صحیح رہا۔ کہ خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کا ہر جزو ضروری ہے۔ اور میرا یہ کہنا بھی صحیح ہوگیا کہ اس آیت میں مثل دوسری آیات کے ایک نہایت ضروری مضمون ہے۔ رہی یہ بات کہ پھر اسی کو کیوں اختیار کیا گیا تو اصل یہ ہے۔ کہ ضروری تو سب ہیں مگر کسی وقت کسی خاص مضمون کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے موقع اور وقت کے لحاظ سے کسی خاص مضمون کو ترجیح ہو جاتی ہے۔ کبھی ایک تعلیم کی زیادہ ضرورت ہے کبھی دوسری تعلیم کی اور اس کے لئے خدا تعالیٰ ہر ضرورت کے موقعہ پر اپنے بندوں کے دل میں القاء کر دیتے ہیں کہ اس وقت اس مضمون کو بیان کرنا چاہیئے یہ کام بھی وہ خود ہی کرتے ہیں ورنہ بیان کرنے والے کو کیا معلوم ہو سکتا ہے۔ کہ اس وقت سامعین کو کس مضمون کی زیادہ ضرورت ہے۔ میں خود اپنی حالت دیکھتا ہوں کہ بعض دفعہ سوچنے سے کوئی مضمون ذہن میں نہیں آتا۔ بلکہ اکثر خود بخود القاء ہو جاتا ہے۔ سفر میں جہاں کہیں بیان ہوتا ہے۔ تو اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی نے ہماری حالت اس سے کہدی ہے۔ کیونکہ بیان اُن کی حالت کے مناسب ہوتا ہے مگر الحمد للہ میری یہ عادت نہیں ہے کہ مسلمانوں کی حالت کا تجسس کروں نہ مجھ سے فرمائشی مضمون کبھی بیان ہو سکے۔ بلکہ توکلاً علی اللہ بیان شروع کر دیتا ہوں اور جو باتیں اللہ تعالیٰ دل میں ڈال دیتے ہیں بیان کر دیتا ہوں اور وہ اکثر سامعین کی ضرورت و حالت کے

مطابق ہوتی ہیں۔ اس سے لوگوں کو شبہ ہوجاتا ہے۔ کہ کسی نے ہماری حالت اس سے کہدی ہے۔ ممکن ہے۔ کہ بعض لوگ اس کو کشف سمجھیں مگر مجھے تو عمر بھر بھی کشف نہیں ہوا[عہ] اور اس میں کشف کی کیا بات ہے۔ بس حق تعالیٰ جس سے کام لینا چاہتے ہیں اسے لینے ہیں اتنی بات تو ہے۔ کہ بحمد اللہ بیان کے وقت یہ نیت ضرور ہوتی ہے۔ کہ اے اللہ ایسا مضمون بیان ہو جو ان لوگوں کی ضرورت کا ہو جس سے اُن کی اصلاح ہو جائے۔ خدا تعالیٰ کو تو علم غیب ہے وہ سب کی حالت جانتے ہیں وہ اس نیت کے بعد ضرورت و حالت کے مطابق مضمون دل میں ڈال دیتے ہیں کہ آج یہ بیان کرو۔ یہی وجہ ہے۔ کہ بعض ہفتوں میں کوئی بات ذہن میں نہیں آتی تو میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آج یہ آیت بیان کے لئے ذہن میں آئی تو میں سمجھا کہ اس مضمون کی دوسرے مضامین سے ضرورت زیادہ ہے۔ اس لئے اس کو اختیار کیا۔ بہر حال اس آیت میں ایک ضروری مضمون ہے جس میں حق تعالیٰ نے ہماری بدحالی کا ایک نہایت سہل علاج بیان فرمایا ہے۔ اس میں تو شک نہیں کہ ہم لوگ بدحال ہیں کوئی شخص بھی اس سے بری نہیں ہاں اتنا فرق ہے کہ کسی کی تباہی کم ہے کسی کی زیادہ باقی بدحالی میں سب مبتلا ہیں الا ماشاء اللہ اور جن کی تباہی کم ہے۔ وہ بہ نسبت اُن لوگوں کے زیادہ پریشان ہیں جن کی تباہی زیادہ ہے اس لئے یہ نہ سمجھا جائے کہ اس مضمون کی ضرورت اُنہی لوگوں کو ہے جو بہت تباہ حال ہیں۔ اور جو کم تباہ حال ہیں اُن کو ضرورت ہی نہیں یا کم ضرورت ہے۔ بلکہ برعکس حالت یہ ہے کہ جن کی تباہی کم ہے۔ اُن کو اس کی ضرورت زیادہ ہے کیونکہ وہ بہ نسبت دوسروں کے زیادہ پریشان ہیں۔ اس کی ایسی مثال ہے۔ جیسے ہم نے اپنے بعض دوستوں کو دیکھا ہے۔ جن پر قرض بہت زیادہ ہے۔ کہ وہ بہ نسبت اُن لوگوں کے زیادہ بے فکر ہیں۔ جن پر قرض تھوڑا سا ہے۔ بس اُن کو تو قرض کی عادت ہوگئی اور اس کے بار کا حس ہی نہیں رہا اب وہ قرض لینے میں بڑے دلیر ہوگئے ہیں۔ اور جس کو قرض کی عادت نہیں اور اُس کے ذمے تھوڑا سا قرض ہوگیا ہے جس کے ادا ہونے کی توقع بھی ہے۔ وہ زیادہ پریشان ہے

عہ میں کہتا ہوں کہ کشف نہ سہی تو الہام ہونے میں تو شک نہیں ۱۲ ظ

بعض دفعہ اُس کو راتوں نیند نہیں آتی۔ اور وہ اُن لوگوں کی حالت پر تعجب کرتا ہے جو ہزاروں کے مقروض ہو کر بھی رات کو چین سے سوتے ہیں اور اس کا راز یہ ہے کہ مصیبت کی فکر اُسی وقت تک ہوتی ہے۔ جب تک اُس کے زوال کی اُمید ہو۔ اور جب زوال کی اُمید نہ رہے تو اب فکر نہیں رہتی بلکہ وہ طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے جیسے دائمی مرض طبیعت ثانیہ بن جاتا ہے۔ اسی طرح جو لوگ کم گناہ کرتے ہیں وہ زیادہ مغموم و پریشان ہیں اور جو زیادہ گناہ کرتے ہیں وہ زیادہ پریشان نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ تو بےحس ہو جاتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات انسان کثرت گناہ کے سبب مایوس ہو جاتا ہے۔ اور یہ سمجھ لیتا ہے۔ کہ اب میری مغفرت تو ہو ہی نہیں سکتی پھر لذات میں بھی کیوں کمی کروں پھر وہ دل کھول کر گناہ کرتا ہے۔ حتیٰ کہ جب مرنے کا وقت آتا ہے۔ تو وہ اُس وقت بھی توبہ و استغفار نہیں کرتا اور اگر اُس سے توبہ کو کہا جائے تو صاف انکار کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اتنے گناہوں کو ایک توبہ کیا کافی ہوگی۔ چنانچہ ابن القیم رحمتہ اللہ علیہ نے لکھا ہے۔ کہ ایک شخص کو مرتے وقت کلمہ پڑھنے کو کہا گیا تو اُس نے انکار کر دیا اور کہا کہ ایک کلمہ سے کیا ہوگا۔ میرے تو گناہ اس قدر ہیں کہ اُن کو ہزار کلمے بھی نہیں دھو سکتے۔ یہ مایوسی تھی۔ اور خدا کی رحمت سے مایوسی کفر ہے۔ تو بعض دفعہ کثرتِ گناہ انسان کو مایوس بنا کر کفر تک پہونچا دیتی ہے (خدا ہر مسلمان کو اس سے بچائے آمین) کثرتِ گناہ میں تو یہ اثر ہے ہی مگر آپ حیرت کرینگے کہ بعض دفعہ یہی اثر طاعت میں بھی ہو جاتا ہے۔ یہ بات کسی کے ذہن میں نہیں آسکتی۔ مگر قربان جایئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ آپ نے اس کو سمجھا ہے۔ اور یہاں سے آپ کو معلوم ہوگا کہ واقعی ہم کو کیسے کامل و اکمل رسول عطا ہوئے ہیں۔ کہ آپ کی نظر کہاں تک پہونچی ہے۔ اور یہی چیز ہے جو صرف انبیاء علیہم اسلام کو عطا ہوئی ہے۔ اسی سے انبیاء علیہم اسلام حکماء سے ممتاز ہیں حکماء کے پاس صرف محسوسات کا علم ہے۔ اور وہ محسوسات ہی کے خواص کو جانتے ہیں۔ اُنہی کی ترکیب و تحلیل کیمیاوی طریقہ سے کر سکتے ہیں۔ بخلاف انبیاء علیہم اسلام کے کہ وہ معانی معقولہ کے خواص کو جانتے ہیں۔ اور جو چیز نظر نہیں آتی۔ بلکہ محض اعتباری و عقلی شے ہے اُس کے آثار کو اُنہوں نے ایسا صحیح سمجھا ہے کہ گیا کوئی کیمیاوی طریقے سے اُن کی تحلیل کرکے

سمجھے گا۔ اور یہیں سے آپ کو فقہا کی بھی قدر ہوگی۔ کیونکہ یہ حضرات علوم انبیا ہی کے حامل ہیں اور معانی معقولہ ہی کی ترکیب و تحلیل و بیانِ خواص میں مشغول ہیں۔ تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باریک بینی دیکھئے کہ اعمال شریہ پر برا اثر مرتب ہونا تو کسی کی سمجھ میں آ سکتا تھا۔ مگر آپ کی نظر دور یہاں پہونچی کہ بعض دفعہ اعمال خیر پر بھی برا اثر مرتب ہوتا ہے۔ اور کیوں نہ ہو آپ کی تو شان یہ ہے علمنی ربی فاحسن تعلیمی وادبنی ربی فاحسن تادیبی جس کو خدا نے لکھایا پڑھایا ہو اُس کی نظر جتنی دور بھی پہونچے کم ہے۔ بظاہر تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ طاعت جتنی بھی ہو۔ اچھی ہے طاعت کے لئے کوئی حد نہ ہونا چاہیئے۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سمجھا کہ طاعت کے لئے بھی ایک حد ہے۔ اور اُسی حد تک وہ محمود ہے اُس سے آگے بڑھنا اچھا نہیں ورنہ اثر برا پیدا ہوگا۔ اور اس کی ایسی مثال ہے۔ جیسے مریض کو دوا کرنا اچھا ہے۔ اور ترکِ دوا برا ہے۔ لیکن دوا کرنے کی بھی ایک حد ہے یہ بات نہیں ہے کہ دوا اچھی شے ہے تو اُس کے لئے کوئی حد ہی نہ ہو بلکہ اگر کوئی مقدار ضرورت سے زیادہ دوا کھائے گا تو اس پر نتیجہ برا مرتب ہوگا۔ یہی حال طاعات کا ہے کہ اُن کے لئے بھی ایک حد ہے۔ گو وہ فی نفسہٖ اچھی چیزیں ہیں اس کو انبیاء علیہم السلام ہی نے سمجھا ہے۔ جو اطبار روحانی ہیں۔ اُنہوں نے بتلا دیا کہ طاعات بھی دوا کی طرح ہیں جیسے ہر دوا کے لئے مقدار اکل و شرب متعلق ہوتی ہے۔ طاعات کے لئے بھی درجات معین ہیں۔ چنانچہ خوفِ الٰہی ایک بڑی طاعت ہے۔ جس کا جا بجا نصوص میں حکم ہے۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بھی ایک حد بیان فرمائی ہے۔ ایک دعا میں آپ فرماتے ہیں اللھم انا نسئلك من خشیتك ما تحول به بیننا و بین معاصیك یعنی اے اللہ میں آپ سے آپکا اتنا خوف مانگتا ہوں جو مجھ میں اور معاصی میں حائل ہو جائے۔ اس میں آپ نے بتلا دیا کہ خوف (طبعی) کا ہر درجہ مطلوب نہیں۔ بلکہ وہ اُسی قدر مطلوب ہے۔ کہ خدا کی نافرمانی سے روک دے۔ کیونکہ تجربہ سے معلوم ہوا ہے۔ کہ خوف (طبعی) کا زیادہ بڑھ جانا مضر ہے کیونکہ ایسے شخص کو ہر وقت حق تعالیٰ کے قہر ہی پر نظر ہوگی۔ تو کوئی عمل بد قابل معافی نہ ہوگا۔ اور عظمت پر نظر کرکے اپنا کوئی عمل قابل قبول نظر نہ آئے گا۔ اور اُس کو نجات کی توقع نہ رہے گی

نتیجہ یہ کہ رحمت حق سے مایوس ہوجائے گا۔ اور مایوسی کفر ہے۔ تو کیا ٹھکانا ہے۔ حضور کی اس رازدانی کا بھلا کون عاقل اس کو تجویز کرسکتا ہے۔ کہ طاعت بھی سبب کفر ہوسکتی ہے۔ مگر حضور نے اس کو سمجھا کہ غلبۂ خوف بعض دفعہ سبب یاس ہوجاتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے۔ کہ یاس کفر ہے۔ فانہ لا ییئس من روح اللہ الا القوم الکفرون۔ اس لئے آپ نے خوف کے سوال میں یہ قید لگا دی ما تحول بہ بیننا وبین معاصیك کہ میں اتنا خوف مانگتا ہوں جو معاصی سے روک دے اور بس یہی وہ علوم ہیں جنکو دیکھکر حکماء بھی دنگ رہ جاتے تھے۔ اور اسی لئے انہوں نے نبوت کی حقیقت کو اپنی کتابوں میں مانا ہے۔ کہ بعض افراد ایسے ہوسکتے ہیں۔ جنپر بلا واسطہ مبدا، فیاض کی طرف سے علوم فائض ہوں اور اسی لئے وہ انبیاء علیہم السلام کی نبوت کا اقرار کرتے تھے۔ چنانچہ کسی حکیم نے اپنے زمانے کے نبی کی نبوت کا انکار نہیں کیا بلکہ اُن کا اصحاب قوت قدسیہ ہونا تسلیم کیا وہ اُن کے علوم کو دیکھکر یہ کہہ اُٹھے۔ کہ اتنا بڑا علم کسی ریاضت یا تعلیم سے حاصل نہیں ہوسکتا تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ مبداء فیاض سے اُن کو علم عطا ہوتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ حکماء نے ایک غلطی کی وہ یہ کہ نبوت کو تسلیم کرکے یہ کہا کہ یہ امیین کے واسطے نبی ہیں (یعنی جاہلوں کے واسطے) ہمارے واسطے نبی نہیں ہیں اور نہ ہم کو اُن کے اتباع کی ضرورت ہے لانا قوم قد ھذبنا نفوسنا بالعلم کیونکہ ہم نے علوم سے اپنے نفوس کو تہذیب بنا لیا ہے۔ اب ہم کو کسی مصلح کی ضرورت نہیں قرآن میں بقول بعض مفسرین فرحوا بما عندھم من العلم ایسے ہی حکماء کے بارے میں ہے۔ اُن کا یہ قول ایسا تھا۔ جیسے بعض یہود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو تسلیم کرکے یہ کہتے تھے۔ کہ آپ نبی تو ہیں مگر اہل عرب کے واسطے ہیں ہمارے واسطے نہیں ہیں۔ کیونکہ ہم خود صاحب کتاب ہیں اور وہ کتاب ہمارے لئے سوید ہے۔ اس کا جواب علماء نے خوب دیا کہ تمہارے نزدیک وہ نبی تو ہیں۔ اور نبی کے لئے صادق ہونا ضروری ہے۔ اور وہی نبی یہ فرماتے ہیں کہ میں تمام عالم کی طرف مبعوث ہوا ہوں اور سب پر میرا اتباع لازم ہے۔ بدون میرے اتباع کے کسی کی نجات نہیں ہوسکتی۔ تم اُنکے اس قول کو کیوں نہیں تسلیم کرتے حالانکہ یہ تسلیم کرتے ہو کہ نبی کی بات جھوٹ نہیں ہوسکتی۔ تو اُن کو اس بات

میں بھی سچا ماننا پڑے گا۔ اور اس بات کا سچا ماننا تمہارے اس قول کے کذب کو مستلزم
ہے۔ کہ وہ خاص اہلِ عرب کے رسول ہیں ہمارے واسطے نہیں ہیں بس اس کا اُن کے
پاس کچھ جواب نہ تھا۔ تو جس طرح یہود نے حضور کو خاص اہل عرب کا رسول کہا تھا اسی
طرح حکماء بھی انبیاء کی نبوت کو تسلیم کر کے اُنہیں خاص عوام کے لئے نبی کہتے تھے اپنے
واسطے نبی نہ کہتے تھے۔ خیر یہ غلطی تو اُن سے ہوئی۔ مگر انبیاء کے علوم عالیہ کیوجہ سے نبوت
کا انکار نہیں کیا۔ بلکہ اُس کی حقیقت کو تسلیم کر کے اپنی کتابوں میں علم النوامیس کے
عنوان سے اس کو ذکر کیا ہے۔ اور آج کل کے حکماء جو حقیقت نبوت ہی کا انکار کرتے ہیں
تو حقیقت میں یہ حکماء نہیں ہیں بلکہ یہ لوگ واقع میں صنّاع ہیں، کہ عجیب وغریب صنائع
کے موجد ہیں گو صنعت بھی مفید چیز ہے مگر اس سے آدمی حکیم نہیں بن سکتا حکمت
علوم معانی سے حاصل ہوتی ہے اور حکماء عصر کے پاس معانی خاک نہیں ہیں بس ان کا
پاس جو کچھ ہے مشاہدہ ہے۔ اُن سے بہتر حکماء تو وہی تھے۔ یعنی حکماء یونانیین کیونکہ
وہ لوگ اہل معانی تھے گو معانی میں اُنھوں نے غلطیاں کی ہیں۔ اور ایسی غلطیاں کی ہیں
کہ علوم نبوت ظاہر ہونیکے بعد مسلمانوں کا ایک بچہ بھی اُن کی غلطی پکڑ سکتا ہے۔ مگر پھر بھی
اُن کے پاس کچھ معانی عقلیہ کا ذخیرہ تھا تو سہی۔ اسی لئے وہ حقیقتِ نبوت کا انکار نہ کر
سکے۔ حکماء عصر کے پاس تو علوم عقلیہ ہیں ہی نہیں۔ اس لئے وہ انبیاء علیہم السلام کے علوم
کی قدر نہیں جان سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے انکار نبوت کی۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ بعض
دفعہ زیادہ گناہوں کی وجہ سے انسان کو مایوسی ہوجاتی ہے۔ تو وہ دل کھول کر گناہ پر
دلیر ہوجاتا ہے۔ اب اُس کو گناہوں سے زیادہ پریشانی نہیں ہوتی (کیونکہ مثل مشہور
ہے الیاس احدی الراحتین کہ ناامیدی سے بھی گونہ راحت ہوجاتی ہے ۱۲ط) اور جس نے
تھوڑے گناہ کئے ہیں وہ رحمت ومغفرت سے مایوس نہیں ہے۔ بلکہ اُس کو اُمید ہے اور
اُمید کی وجہ سے معافی کی فکر بھی ہے۔ تو وہ زیادہ پریشان ہے۔ اسی لئے میں نے کہا تھا
کہ جو لوگ کم تباہ حال ہیں اُن کو اس مضمون کی زیادہ ضرورت ہے کیونکہ وہ زیادہ پریشان
ہیں۔ ظاہر میں تو خیال یہ ہوتا ہے۔ کہ گناہوں کی کثرت سے غم زیادہ ہوتا ہوگا مگر واقع

میں اس کا عکس ہے کہ تھوڑے گناہ والے کو زیادہ غم ہوتا ہے۔ اور ان میں سے جو خاص لوگ ہیں اُن کی تو یہ حالت ہے۔ ؎

بر دل سالک ہزاران غم بود　　　گر زباغ دل خلالے کم بود

یعنی گناہ تو گناہ اگر اُس کی قلبی حالت میں ذرا سا بھی تغیر ہوجاتا یا ایک وار بھی کم ہوجاتا ہے تو اُسپر غم کا پہاڑ ٹوٹ جاتا ہے۔ اگر اس وقت کوئی شیخ محقق مل گیا تو اُس کی تسلّی سے سنبھل جاتا ہے۔ ورنہ بعض دفعہ ہلاکت تک کی نوبت آجاتی ہے۔ چونکہ مولانا محقق ہیں اسلئے دوسری جگہ تسلّی بھی فرماتے ہیں ؎

چونکہ قبضے آیدت اے راہرو　　　آن صلاح تست آیس دل شو

چونکہ قبض آمد تو در وے بسط بین　　　تازہ باش و چین میفگن بر جبین

اس کا یہ مطلب کوئی صاحب نہ سمجھیں کہ قبض سے تنگ آنا اور پریشان ہونا نازیبا حرکت اور بُری حالت ہے۔ ہرگز نہیں کیونکہ قبض سے پریشانی کا ہونا تو طبعی اور لازمی امر ہے ہاں شیخ کی تسلّی کے بعد عقلاً پریشان رہنا یہ بُرا ہے۔ اور اگر غور کرکے دیکھا جائے۔ تو تسلّی قبض پر نہیں ہوتی یعنی شیخ کی تسلی کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ خود قبض کی ذات سے راضی رہو اور یہ بالذات مطلوب حالت ہے۔ اس پر خوش رہو۔ بلکہ تسلّی اُن مصالح اور منافع پر ہوتی ہے۔ جو اکثر قبض پر مرتب ہوجاتے ہیں (اس کی ایسی مثال ہے جیسے بیمار کی تسلّی کی جاتی ہے۔ کہ میاں بخار آگیا تو کیا حرج ہے بدن کا تنقیہ ہوگیا یا گناہوں کا کفارہ ہوگیا۔ تو یہ مطلب نہیں ہوتا کہ بیماری مطلوب شے ہے۔ اسپر راضی رہو۔ بلکہ بیماری سے جو بدن کا تنقیہ ہوگیا ہے۔ یا اور بعض فوائد حاصل ہوگئے ہیں۔ اُن پر تسلی کی جاتی ہے۔ کہ ان منافع کا خیال کرکے پریشانی کو کم کرنا چاہیئے۔ ورنہ جس طرح بیماری خود فی ذاتہ تسلی کے قابل نہیں ہے اُسی طرح قبض اپنی ذات سے تسلی کی شے نہیں ہے ۱۲ ظ) ہم اور آپ تو کیا چیز ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جب اول وحی نازل ہوئی ہے۔ تو اس کا قصہ حدیث میں اس طرح آیا ہے۔ کہ پہلے دن ثقل وحی سے یا خوف وعظمت الٰہی سے آپ کو بخار آگیا۔ آپ گھبرائے ہوئے دولتخانے پر تشریف لائے اور کمل اوڑھکر لیٹ گئے۔ جب کچھ افاقہ ہوا تو حضرت خدیجہ

سے آپ نے یہ واقعہ بیان فرمایا وہ آپ کو حضرت ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو توراۃ وانجیل کے بڑے عالم تھے۔ انہوں نے وحی کا قصہ سُنکر آپ کی نبوت کی تصدیق کی اور یہ بھی کہا۔ کہ افسوس آپ کی قوم آپ کو مکہ سے ایک دن نکالے گی۔ اگر میں زندہ رہا تو آپ کی پوری مدد کروں گا۔ غرض ہر طرح آپ کو معلوم ہو گیا کہ میں نبی ہوا ہوں۔ اس کے بعد تین سال تک وحی منقطع ہو گئی اس وقت آپ اس قدر پریشان تھے۔ کہ بعض دفعہ پہاڑ پر چڑھکر ارادہ کرتے کہ یہاں سے گرا کر اپنے کو ہلاک کردوں یہ قبض ہی کی حالت تھی اسی کو مولانا نے فرمایا ہے ؎

بر دلِ سالک ہزاران غم بود　　گر ز باغ دل خلالے کم بود

آپ اشتیاقِ وحی میں بے چین تھے اور اس بے چینی میں کسی وقت اپنے کو ہلاک کرنے کا قصد فرماتے تھے۔ کہ فوراً حضرت جبرئیل علیہ السلام ظاہر ہوتے اور آپ کی تسلی فرماتے کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ ابدا افضل ما صلی علی احد من خلقہ ۱۲) آپ اس امت کے نبی ہیں خدا تعالے نے آپ کو رسول بنایا ہے۔ تو جب قبض میں حضور کی یہ حالت تھی تو دوسرا کون ہے جو اس پر راضی ہو اور ذرا بھی پریشان نہ ہو ہاں اس پر رضا اس طرح ہو جاتی ہے۔ کہ اس کے مصالح و منافع کے استحضار سے کسی قدر قلب کو شگفتگی ہو جاتی ہے۔ پھر اُن مصالح کا علم کبھی تو اجمالی ہوتا ہے جس کو مولانا نے ان اشعار میں بیان فرمایا ہے ؎

چونکہ قبضے آیدت اے راہرو　　آن صلاح تست آیس دل مشو

محقق کے ارشاد سے اجمالاً معلوم ہو گیا کہ قبض میں بھی مصالح ہوتی ہیں یہ کوئی بُری حالت نہیں جس سے سالک خواہ مخواہ اپنے کو مردود سمجھنے لگے۔ اور فرماتے ہیں ؎

چونکہ قبض آید تو در وے بسط بین　　تازہ باش و چین میفگن بر جبین

اس میں یہ بتلا دیا کہ قبض کے بعد بسط بہت قوی ہوتا ہے۔ یہ کلمہ ایسا ہے جیسے ان مع العسر یسرا میں کلمہ مع بمعنے بعد تم اس کا خیال کر کے شادان و فرحان رہو پریشان نہ ہو یہ تو اجمالی مصالح ہیں اور کبھی بعض مصالح کا تفصیلی علم بھی ہو جاتا ہے۔ تو اس سے پوری تسلی ہو جاتی ہے۔ مثلاً کبھی قبض میں یہ مصلحت ہوتی ہے۔ کہ بعض اوقات سالک پر بسط کی حالت میں کسی وارد کے عطا ہونے سے ایک تازگی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے

اُس وقت اگر حق تعالیٰ دستگیری نہ فرمائیں تو یہ کبر و عجب میں مبتلا ہو کر تباہ و برباد ہو جاوے حق تعالیٰ نے اس کی یوں دستگیری فرمائی کہ قبض طاری کر دیا۔ اور ساری کیفیات و واردات کو سلب فرمالیا۔ اب اُس کی یہ حالت ہے۔ کہ بجائے ناز و انداز کے یوں دیکھتا ہے۔ کہ میں ساری دُنیا سے زیادہ ذلیل ہوں۔ اُس وقت سچ مچ اُس کو اپنے سے زیادہ ذلیل و حقیر کوئی نظر نہیں آتا چنانچہ ایک سالک نے قبض کی حالت میں مجھ سے یہ بیان کیا کہ مجھ کو یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ میں فرعون و ہامان سے بھی بدتر ہوں یہ بات لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی اور جب تک انسان ایسا ہی نہ بن جائے۔ اُس وقت تک اہلِ دل کا کلام سمجھ میں آ بھی نہیں سکتا۔ حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عارف اُس وقت تک عارف نہیں ہوتا۔ جب تک اپنے کو کافر فرنگ سے بدتر نہ سمجھے صاحبِ سالک پر واقعی ایسی حالت گزرتی ہے۔ کہ وہ سچ مچ تمام مخلوق سے اپنے کو بدتر سمجھتا ہے۔ خیر اگر کسی پر یہ حالت نہ گزری ہو تو وہ اس کلام کو انجام ہی کے اعتبار سے سمجھ لے۔ کہ نہ معلوم میرا انجام کیسا ہو ممکن ہے۔ کہ کافرِ فرنگ کا انجام مجھ سے اچھا ہو جائے کیونکہ حالت یہ ہے۔ کہ ؎

گہ رشک برد فرشتہ بر پاکی ما — گہ خندہ زند دیو ز ناپاکی ما
ایمان چو سلامت بہ لبِ گور بریم — تحقیق شود پاکی و ناپاکی ما

تو اپنے دل کو یہی سمجھانا چاہیئے کہ انجام معلوم ہونے سے پہلے مجھے کیا حق ہے۔ کہ اپنے کو کسی سے افضل اور اچھا سمجھوں (اور گو سب سے بدتر ہونا بھی متیقن نہیں مگر محتمل تو ہے۔ اور احتمال کی بنا پر اپنے کو اچھا سمجھنا مضر اور بُرا سمجھنا مفید ہے۔ بشرطیکہ یاس کا درجہ نہ ہو۔ اس لئے اپنے کو سب سے بُرا ہی سمجھنا چاہیئے ۱۲ ظ) ایک شخص نے مجھ سے پوچھا کہ یزید پر لعنت کرنا کیسا ہے۔ میں نے کہا جائز ہے۔ اگر یہ اطمینان ہو کہ ہم اس سے اچھی حالت میں مرینگے۔ تو واقعی ہمیں کسی سے اپنے کو اچھا سمجھنے کا حق ہے۔ ہماری حالت یہ ہے۔ کہ انجام کی کچھ خبر ہی نہیں ہے۔ کہ کیا ہوگا۔ خوب کہا ہے ؎

غافل مرو کہ مرکبِ مردانِ مرد را — در سنگلاخ بادیہ پیہا بریدہ اند

نومید ہم مباش کہ رندان بادہ نوش ناگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

توصوفیہ کے اس کلام کی ایک موٹی سی توجیہ تو یہی ہے۔ کہ خاتمہ کا خیال کرکے اپنے کو حقیر و ذلیل سمجھتا رہے۔ لیکن یہ تو اہل عقل کے سمجھنے کے واسطے توجیہ ہے اور اہل حال تو خاتمہ کے خیال سے قطع نظر کرکے بھی حالت موجودہ ہی میں اپنے کو سب سے بدتر سمجھتے ہیں باقی اس کو میں سمجھا نہیں سکتا۔ بس ایک حالت ہے جس پر گزرتی ہے وہی جانتا ہے۔ ؎

پرسید یکے کہ عاشقی چیست گفتم کہ چو ماشوی بدانی

بس اس وقت تو تقلیداً مان لیا جائے کہ سالکین پر ایسی حالت گزرتی ہے جیسا ہمارے ایک دوست نے کہا تھا کہ مجھے یوں معلوم ہوتا ہے۔ کہ میں فرعون وہامان سے بھی بدتر ہوں تو جب بسط میں غلبۂ واردات سے ناز کی سی کیفیت سالک میں پیدا ہونے لگتی ہے۔ اُس وقت حق تعالیٰ اُس پر قبض طاری کر دیتے ہیں تاکہ وہ اپنی عبدیت کا مشاہدہ کرے اور اپنے کو سب سے ذلیل وحقیر سمجھنے لگے اور دعویٰ اور ناز نہ کرے۔ تو دیکھئے یہ کتنی بڑی رحمت ہے۔ اگر اس وقت قبض وارد نکیا جاتا تو بسط میں تو یہ تباہ ہو جاتا۔ کبھی قبض میں یہ مصلحت ہوتی ہے۔ کہ سالک کے لئے انوار حجاب راہ بنے ہوئے تھے ذکر میں جو اس پر تجلیات و انوار کا انکشاف ہوتا تھا یہ اُنہی کی سیر میں مشغول ہو گیا۔ اور اُنہی پر التفات کرنے لگا حالانکہ مقصود توجہ الی الحق ہے۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے۔ کہ حجاب دو قسم کے ہیں ایک حجاب ظلمانی ایک حجاب نورانی حجاب ظلمانی تو یہی وساوس وخطرات ہیں جو ذکر کے وقت دنیوی امور کے متعلق قلب میں آیا کرتے اُن پر توجہ کرنا تو ظاہر ہے۔ کہ مضر ہے۔ اور حجاب نورانی یہ ہے۔ کہ عالم ملکوت کے انوار وتجلیات منکشف ہوں وہ بھی ایک عالم ہے جو کہ غیر خدا ہے۔ اس لئے اُس کی کیفیات پر بھی توجہ نہ کرنا چاہیئے حضرت حاجی صاحب یہ بھی فرماتے تھے کہ حجاب نورانی ظلمانی سے اشد ہے۔ کیونکہ اُس میں بوجہ نورانیت کے زیادہ مشغولی ہوتی ہے دوسرے وہ ایک نئی سی چیز ہے۔ اُس کو دیکھکر سالک سمجھتا ہے کہ میں کامل ہو گیا حالانکہ وہ ہنوز غیر حق کے ساتھ اُلجھا ہوا ہے۔ کیونکہ وہ انوار وتجلیات بھی اُس کے شاغل عن

الحق ہیں اور اُسکو اُنمیں ایک لذت بھی ہوتی ہے. حتیٰ کہ اگر وہ کسی وقت محجوب ہو جاتے ہیں تو بڑا رنج ہوتا ہے. تو یہ میاں اب تک اپنی لذت ہی کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں مقصود تک رسائی کہاں اس وقت حق تعالیٰ قبض طاری کرکے ان انوار وتجلیات کو سلب کر لیتے ہیں تاکہ سالک غیر حق سے ہٹ کر حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو اور اس میں بندہ کی بڑی مصلحت ہوتی ہے. ورنہ مقصود سے رہ جاتا پس اگر کسی وقت تمام انوار کو چھپا دیا جائے. تو یہ حق تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے ایسے وقت گھبرانا نہ چاہیئے. غرض یہ چند مثالیں ہیں تفصیلی حکمتوں کی ان کے سوا اور بھی مصلحتیں قبض میں ہوتی ہیں جو اکثر سالک کو وقت پر خود ہی معلوم ہو جاتی ہیں تو ان اجمالی یا تفصیلی حکمتوں کے استحضار سے قبض میں تسلّی ہو جاتی اور کچھ شگفتگی قلب میں آجاتی ہے ورنہ درحقیقت قبض تسلی کی چیز نہیں وہ تو موجب غم ہی ہوتا ہے. دراصل تسلّی تو جبھی ہوتی ہے. جب کسی قسم کا بسط ہو (معلومات دُنیا میں بھی تو یہ بات ظاہر ہے کہ مال ومتاع کا چوری ہو جانا یا لُٹ جانا تو موجب رنج ہی ہے. یہ اور بات ہے کہ ثواب آخرت کو سوچ کر یا مال جانیکے بعد جو حفاظت ونگہداشت سے بے فکری ہو گئی. اس راحت کو مستحضر کرکے دل کو سمجھا لیا جائے. مگر نفس مال کا چوری جانا ایسی چیز نہیں کہ انسان خود اسپر طبعًا راضی ہو جائے اُس سے تو ایک دفعہ کو صدمہ ہو ہی گا. اور اس کا تصور قائم کر لینا بھی موجب الم ہوگا. ہاں اس کے تصور کو چھوڑ کر دوسری باتوں میں دل کو لگایا جائے تو کچھ تسلّی ہو سکتی ہے. اسی طرح قبض بھی بظاہر متاع باطن کا لُٹ جانا اس سے صدمہ اور پریشانی کا ہونا لازمی وطبعی امر ہے. گو اسکے مصالح ومنافع کی طرف قلب کو متوجہ کرکے تسلّی حاصل ہو جائے. مگر خود نفس قبض پر دل راضی نہیں ہوتا نہ یہ اپنی ذات سے تسلّی کی شے ہے. بلکہ جس طرح دُنیا کے معاملات میں اصل تسلی کی چیز یہ ہے کہ روزانہ نئی آمدنی ہوتی رہے. اور ہر دن چھنا چھن روپے ہاتھ میں آتے رہیں اسی طرح باطن میں اصل تسلی کی چیز بسط ہی ہے. جس میں وقتًا فوقتًا یومًا فیومًا متاع باطن کو ترقی ہوتی رہتی اور جدید ولذیذ واردات ہر دم وارد ہوتے رہیں ۱۲ ظ) میں یہ کہہ رہا تھا کہ گو گناہ کرنے والے گیں جو خاص لوگ ہیں اُن کی حالت یہ ہے. کہ گناہ پر تو وہ کیا ہی صبر کر سکتے ہیں

ایک ذرا سے قلبی تغیر اور وارد کے فوت ہونے پر ہی اُن کو قرار نہیں آتا اسی سے وہ تو بےچین اور پریشان ہوجاتے ہیں چنانچہ آپ نے سُن لیا کہ سالکین کی قبض میں کیا حالت ہوتی ہے۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ تھوڑے گناہ والا بہ نسبت بہت گناہ والوں کے زیادہ پریشان ہوتا ہے۔ اور جس کے پاس بالکل گناہ نہیں وہ اس سے بھی زیادہ پریشان ہے۔ جس کے پاس تھوڑے سے گناہ ہیں (اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص نے قرض لینا تو کبھی جانا ہی نہ ہو بلکہ اس سے بڑھکر وہ ہمیشہ سے اس بات کا عادی ہو کہ اپنے پاس سَو پچاس روپے ہر وقت جمع رکھتا ہے کبھی خالی ہاتھ نہیں رہتا اور ضرورت والوں کو ضرورت کے وقت دیتا دلاتا رہتا ہے۔ ایسے شخص کا اگر کبھی اتفاق سے ہاتھ خالی ہوجائے تو سمجھ لیجئے۔ اس کو کتنی پریشانی ہوگی تھوڑے سے مقروض کو قلیل قرض سے وہ پریشانی نہ ہوگی۔ جو اس شخص کو محض اپنا ہاتھ خالی ہوجانے سے ہوگی کیونکہ جس نے ہمیشہ دوسروں کو دیا ہو کبھی کسی سے ایک پیسہ کا ادھار نہ لیا ہو اُس کو تو اس حالت کے تصور سے بھی لرزہ آوے گا۔ کہ آج میرا ہاتھ خالی ہے۔ اور شاید مجھے دوسروں سے مانگنا پڑے۔ اہل اللہ کی یہی حالت ہے۔ کہ گناہ تو کیا وہ تو احتمال گناہ سے کانپتے ہیں واردات کے کم ہوجانے سے ہی گھبرا جاتے ہیں۔ کیونکہ اس سے کسی قدر تنزل اور بعد کا وہم سا ہوجاتا ہے ۱۲) یہ سلسلہ کلام اسیر شروع ہوا تھا۔ کہ تھوڑے گناہ میں غم زیادہ ہوتا ہے۔ کیونکہ ابھی اُس کو گناہ کے تشتر سے تکلیف کا احساس ہوتا ہے۔ اور جو لوگ واردات کی کمی سے بھی پریشان ہوجاتے ہیں وہ پہلا گناہ سے تو کیوں پریشان نہ ہونگے یہی پریشانی ہے جو سب میں مشترک ہے کسی کو اس کا زیادہ احساس ہے کسی کو کم اور جو کسی کو اپنی اس حالت پر نظر اور تاسف بھی نہ ہو تو اُس کی یہ حالت خود قابلِ تاسف ہے۔ اول تو اپنے گناہوں پر نظر کرکے ہم کو خود رونا چاہیئے۔ اور جو کسی کو رونا نہ آوے تو اس رونا نہ آنے پر رونا چاہیئے کہ افسوس میں ایسا سنگدل ہوں کہ مجھے اپنی بدحالی پر رونا بھی نہیں آتا اسیر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ جب اُسکو کسی بات پر رونا نہیں آتا تو اسی پر کیوں آئیگا تو سمجھ لیجئے

کہ اس رونے کا مطلب یہ ہے کہ اس پر رونے کی کوشش کرنی چاہیئے چاہے رونا آئے یا نہ آئے تم کو رونے کی صورت بنانی چاہیئے۔ اس کی دلیل حدیث ہے فان لم تبکوا فتباکوا۔ اور اکثر قاعدہ تو یہ ہے کہ رونے کی کوشش کرنے سے رونا آہی جاتا ہے چنانچہ بہت دفعہ ایسا ہو جاتا ہے۔ اور اگر رونا نہ بھی آئے تو حضور نے تباکی ہی کو بکا کا بدل قرار دیدیا ہے۔ اور جب کسی چیز کے لیئے کوئی بدل ہوتا ہے۔ تو وہاں مقصود کوئی ایسی چیز ہوتی ہے۔ جو اصل و بدل میں مشترک ہو تو معلوم ہوا کہ رونے سے جو مقصود ہے وہ رونے کی کوشش کرنے سے بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ طبیب جب کوئی دوا لکھکر اُس کا بدل بتلاتا ہے۔ تو وہاں اُس کا مقصود ایک ایسا اثر ہوتا ہے۔ جو دونوں دواؤں میں مشترک ہے۔ پس جب تباکی بکائے عین کا بدل ہے تو معلوم ہوا کہ بکائے عین خود مقصود نہیں بلکہ مقصود وہ چیز ہے۔ جو اُس میں اور تباکی میں مشترک ہے۔ وہ کیا چیز ہے وہ بکار قلب ہے۔ جس کو دل کا رونا کہتے ہیں۔ پس تباکی میں گو آنکھ سے رونے کی صورت نہ پائی جائے مگر رونے کی حقیقت موجود ہے یعنی دل کا رونا اور دل کا رونا کیا ہے۔ اُس کی حقیقت ہے۔ فکر اور رنج و ملال تو جو شخص رونے کی کوشش کرے گا۔ ظاہر ہے کہ وہ اس سے خالی نہ ہوگا۔ اسلیئے اس تقریر پر شبہ نہ رہا۔ ایک دوست مجھ سے کہنے لگے کہ حج سے آکر مجھے رونا ہی نہیں آتا گویا وہ اپنی اس حالت پر افسوس کر رہے تھے۔ میں نے کہا کہ رونا نہ آنے پر رنج کرنا یہ بھی رونا ہی ہے۔ پہلے آپکی آنکھ روتی تھی اُس وقت ایک مصرعہ کے مصداق تھے ؎ اے خوشا چشمیکہ آں گریان اوست اور اب دل روتا ہے اسوقت آپ دوسرے مصرع کے مصداق ہیں ؏ اے خوشا آں دل کہ آں بریان اوست۔ اور اصل مقصود دل کا رونا ہے۔ آنکھ کا رونا مقصود نہیں اس پر ایک حکایت یاد آئی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایکبار وعظ فرمایا تو لوگوں نے کپڑے پھاڑ دیئے آپ نے فرمایا لا تشقوا جیوبکم بل شقوا قلوبکم۔ یعنی گریبان چاک نہ کرو بلکہ دلوں کو چاک کرو۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ گریبان چاک کرنیوالے قابل ملامت ہیں بلکہ آپ کا مطلب یہ ہے کہ اصل مقصود دل کا چاک کرنا ہے۔ اس میں سعی کرنا چاہیئے

اور یہ حالت جسکی وجہ سے کپڑے .... چاک کئے جارہے ہیں مقصود نہیں نہ یہ کچھ کمال ہے۔ پس ایسے لوگ کامل نہیں۔ اُن کو اہل کمال تو نہ سمجھے مگر طعن بھی نکرے کیونکہ بعضے معذور بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ اسی لئے شیخ سعدی شیرازی جنکا لقب تاج الاولیاء ہے۔ فرماتے ہیں ؎

مکن عیب درویش حیران و مست کہ غرق ست ازاں می زند پا و دست

اس میں تو یہ تعلیم ہے کہ ان پر اعتراض نہ کرو آگے اُن کی حالت بتلاکر عذر ظاہر کرتے ہیں ؎

بہ تسلیم سر در گریباں برند چو طاقت نماند گریباں درند

پس یہ لوگ معذور تو ہیں گو صاحب کمال نہیں ہیں۔ ان کپڑے پھاڑنیوالوں کی حکومت صرف ظاہر پر ہوتی ہے۔ اسلئے وہ اپنے ظاہر ہی میں جو تصرف چاہتے ہیں کرڈالتے ہیں باطن پر اُن کی حکومت نہیں ہوتی اور اہل کمال وہ ہیں جن کی حکومت ظاہر و باطن دونوں پر ہوتی ہے۔ کہ وہ کسی قلبی حالت سے ازجارفتہ نہیں ہوجاتے۔ وہ حالت اُن پر غالب نہیں ہوتی بلکہ وہ خود حالت پر غالب ہوجاتے ہیں ایک دفعہ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ مجلس میں تشریف فرما تھے۔ کسی نے کوئی عجیب شعر پڑھا اُسپر ایک صوفی کو سخت وجد ہوا کہ قریب ہلاک ہوگیا اور سارے مجمع پر ایک کیفیت طاری ہوگئی مگر حضرت جنید ویسے ہی وقار سے بیٹھے رہے جیسے تھے اُنکو ذرا تغیر نہ ہوا تو کسی نے سوال کیا کہ اے جنید کیا تمکو اس شعر سے لطف نہیں آیا جو ذرا بھی وجد نہ ہوا تو آپ نے جواب دیا وتری الجبال تحسبہا جامدۃً وہی تمر مر السحاب یعنی پہاڑوں کو تم (قیامت میں) ایک جگہ پر ٹھہرا ہوا دیکھو گے حالانکہ وہ ایسے تیز چلتے ہوں گے۔ جیسے بادل چلا کرتا ہے۔ مطلب یہ کہ یہ لوگ ہلکے ظرف تھے۔ اُن کی حرکت سب کو نظر آگئی۔ اور کامل پہاڑ کی طرح ہے۔ کہ اُسکی حرکت نظر نہیں آتی ظاہر میں وہ ساکن معلوم ہوتا ہے اور درحقیقت وہ بہت تیز جارہا ہے۔ اور ذرا سی دیر میں کہیں کا کہیں پہونچ جاتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے زیادہ صاحب کمال اور انوار باطنیہ سے مالامال کون ہوا ہوگا۔ مگر بجز ایک آدھ قصے کے مثلاً حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ حضور کا نام لیکر بیہوش ہوگئے تھے

باقی صحابہ سے عموماً یہ بات ثابت نہیں ہے۔ کہ کسی نے جوش و ولولہ میں کپڑے پھاڑ دئے ہوں یا بیہوش ہو گئے ہوں یا ناچنے لگے ہوں اور اگر ایک آدھ سے کبھی اتفاقیہ بیہوش ہو جانا ثابت بھی ہے۔ تو کن سے جو حضرت ابو بکر نہ تھے۔ حضرت عمر فاروق نہ تھے۔ حضرت عثمان نہ تھے۔ حضرت علی نہ تھے رضی اللہ عنہم حالانکہ یہ حضرات اکمل الصحابہ ہیں تو جو انکے سامنے موخر درجے میں تھے۔ اُن میں ایک آدھ قصہ شاذ و نادر ایسا ہو گیا عموماً اُنکی بھی یہ حالت نہ تھی۔ حضرات صحابہ میں جو سب سے زیادہ کامل ہیں وہ سب سے زیادہ مضبوط اور مستقل مزاج ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حادثہ وصال مسلمانوں کیلئے کچھ کم جانکاہ نہ تھا۔ حضرات صحابہ اسپر جسقدر بھی روتے تھوڑا تھا۔ اور معلوم ہمارے سامنے یہ حادثہ ہوتا تو ہم لوگ کیا سے کیا کر ڈالتے۔ مگر حضرات صحابہ نے بجز آنسو بہا لینے اور تنہا بیٹھکر رو لینے کے کچھ نہیں کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ بظاہر صحابہ میں سب سے زیادہ مضبوط اور دلیر و مستقل مزاج نظر آتے تھے۔ مگر اُس وقت اُن کی بھی یہی حالت تھی۔ کہ حواس باختہ ہو گئے اور تلوار ہاتھ میں لیکر پکارتے تھے۔ کہ جو شخص یہ کہے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا اُس کی گردن اُڑا دوں گا۔ آپ زندہ ہیں اور ابھی منافقین کی خبر لیں گے یہ خبر سُنکر حضرت صدیق رضی اللہ عنہ دوڑے ہوئے عوالی سے تشریف لائے۔ اور سیدھے حضرت عائشہ کے گھر میں جا پہونچے حضور کا وصال ہو ہی چکا تھا حضرت صدیق نے چادر چہرہ مبارک سے ہٹائی اور بے اختیار پیشانی انور کا بوسہ لیا اُس وقت حضرت صدیق سب سے زیادہ مضبوط نکلے۔ اُن کی زبان سے وصال نبوی کا یقین ہو جانے کے بعد کوئی بات نہیں نکلی سوا اس کے کہ ایک دو دفعہ اتنا کہا وا خلیلاہ و حبیباہ لقد طبت حیا و میتا لا انت اکرم علی اللہ من ان یذیقک الموت مرتین (رز تفلا) اسکے بعد غایت ضبط کیساتھ حجرہ سے باہر آئے صحابہ تمام کے تمام حضرت صدیق کے مُنہ کو تاک رہے تھے کہ دیکھئے اُنکے مُنہ سے کیا نکلتا ہے اور یہ کیا خبر سُناتے ہیں۔ حضرت صدیق نے اول تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا علی اسلک یارجل۔ اے شخص بس ٹھہر جا۔ مگر انہوں نے ایک نہ سُنی اور برابر اپنی اُسی بات کو پکارتے رہے۔ اسکے بعد حضرت صدیق سیدھے

ممبر نبوی پر تشریف لیگئے اور خطبہ ماثورہ کے بعد فرمایا۔ ایھا الناس من کان منکم یعبد محمداً
فان محمدا قد مات ومن کان یعبد اللہ فان اللہ حی لایموت۔ وما محمد الا رسول قد خلت
من قبلہ الرسل افئن مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم ومن ینقلب علی عقبیہ فلن یضر اللہ
شیئا وسیجزی اللہ الشکرین۔ انک میت وانھم میتون ثم انکم یوم القیمۃ عند ربکم تختصمون
یعنی اے لوگو جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو معبود سمجھتا ہو تو وہ سُن لے کہ آپ کا تو وصال
ہوگیا۔ اور جو خدا تعالیٰ کو معبود سمجھتا ہوا اُسکی عبادت کرتا ہو تو وہ سُن لے کہ خدا حی لایموت
ہے وہ کبھی نہ مرے گا اسکے بعد یہ آیت پڑھی وما محمد الا رسول الخ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ محمد صلی اللہ
علیہ وسلم ایک رسول ہی تو ہیں۔ اُن سے پہلے اور بھی رسول گذر چکے ہیں تو کیا اگر
محمد صلی اللہ علیہ وسلم مرجائیں یا قتل ہو جائیں تو تم دین حق سے اُلٹے پاؤں ہٹ
جاؤ گے۔ اور جو اس طرح ہٹے گا۔ وہ خدا تعالیٰ کو کچھ بھی نقصان نہ دے گا (اپنا نقصان
کرے گا۔) اور حق تعالیٰ (ایسے وقت) میں شکر وحمد کرنیوالوں کو جزا دیں گے۔ اور یہ
آیت بھی پڑھی انک میت جسکا ترجمہ یہ ہے۔ کہ حق تعالیٰ حضور کو خطاب فرماتے ہیں
کہ آپ بھی ایک دن مرنیوالے ہیں اور یہ کفار بھی پھر تم سب قیامت کے دن اپنا جھگڑا
خدا کے پاس لیجاؤ گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو یہ مضمون اور یہ آیتیں سُنیں تو
سمجھ گئے۔ کہ حضور کا وصال ہو چکا۔ اب اُن سے کھڑا بھی نہ ہوا گیا مارے غم کے تلوار
ٹیک کر بیٹھ گئے۔ اور رونے لگے۔ صحابہ فرماتے ہیں کہ یہ آیات ہمارے ذہن سے
اسوقت بالکل غائب ہوگئیں تھیں۔ جس وقت حضرت صدیق نے ممبر پر اُن کو پڑھا ہے
تو یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ گویا ابھی اُتر رہی ہیں۔ یہ سب کچھ ہوا مگر تھوڑی ہی دیر میں سب
صحابہ سنبھل گئے اور دین کے کاموں میں مشغول ہوگئے۔ مگر جیسے حضرت صدیق افضل الصحابہ
تھے۔ ویسے ہی اسوقت سب سے زیادہ صاحب ضبط واستقلال بھی نکلے۔

ایک واقعہ حضرت صدیق کے استقلال کا اس سے بھی زیادہ عجیب ہے وہ یہ کہ حضور کے
وصال کے بعد کچھ قبائل عرب مرتد ہوگئے تھے۔ جن میں بعض تو مسیلمہ کذاب وغیرہ
مدعیان نبوت کی ساتھ ہوگئے۔ اور بعض لوگ کسی کے ساتھ تو نہیں ہوئے۔ بلکہ ظاہر میں

اپنے کو مسلمان کہتے رہے توحید و رسالت کے مقر رہے کعبہ کو قبلہ مانتے رہے۔ نماز کی فرضیت کے قائل رہے۔ مگر زکوٰۃ کی فرضیت سے منکر ہو گئے اور یہ کہا کہ فرضیت زکوٰۃ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے مخصوص تھی اب فرض نہیں اور علت یہ بتلائی کہ حضور کے زمانے میں مسلمانوں پر فقر زیادہ تھا۔ اس لئے اسوقت زکوٰۃ کی ضرورت تھی۔ اب وہ حالت نہیں رہی۔ اسلئے فرضیت بھی باقی نہیں رہی۔ جیسے آج کل بھی بہت سے لوگ اس قسم کی تاویلیں کیا کرتے ہیں۔ پہلی جماعت کے بارے میں سب صحابہ کی بالاتفاق یہ رائے تھی۔ کہ انکی ساتھ جہاد کر کیا جائے۔ مگر دوسری جماعت کے حق میں سب کی رائے نرم تھی۔ حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بھی یہ رائے تھی۔ کہ انکی ساتھ نرمی کیجائے اور جو کھلے کافر ہیں صرف اُن سے لڑائی کیجائے ان لوگوں پر جہاد نہ کیا جائے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی رائے اس دوسری جماعت کے متعلق بھی وہی تھی۔ جو اور مرتدین کے متعلق تھی۔ وہ ان لوگوں کو کافر کہتے تھے۔ اور یہ فرماتے تھے۔ کہ جو شخص نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا میں اُسکی ساتھ قتال کروں گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے تھے۔ کہ یہ لوگ تو لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہتے ہیں ہمارے قبلہ کی طرف نماز پڑھتے ہیں۔ اُن پر کیونکر جہاد ہو سکتا ہے۔ اور اُنکو کفار کی طرح کیسے قتل کیا جا سکتا ہے۔ حضرت صدیق نے فرمایا کہ یہ سب کچھ سہی مگر یہ لوگ نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرتے ہیں (کہ نماز کو تو فرض مانتے ہیں اور زکوٰۃ کو فرض نہیں مانتے حالانکہ شریعت نے دونوں کو فرض کیا ہے۔ تو یہ لوگ فرض قطعی کے منکر ہیں اور) ان لوگوں نے دین کو بدل دیا ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے مَنْ بَدَّلَ دِینَهٗ فَاقْتُلُوهُ۔ اسلئے میں ان کی ساتھ قتال کروں گا حضرت عمر نے پھر کہا کہ آپ کلمہ گو آدمیوں سے کیسے قتال کریں گے حضرت صدیق نے فرمایا اجبار فی الجاهلية خوار فی الاسلام واللہ لو منعونی وفی روایۃ عناقا عقالا کانوا یؤدونه الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لقاتلتهم علیه اے عمر یہ کیا کہ تم جاہلیت میں تو زبردست تھے۔ اور اسلام میں اتنے بودے ہو گئے بخدا اگر یہ لوگ ایک رسی کو یا بکری کے بچے کو بھی روکیں گے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کو دیا کرتے تھے۔ تو میں اُس پر بھی اُن سے قتال کروں گا۔ اور یہ بھی فرمایا کہ جب یہ آیت نازل ہوئی ان اللہ معنا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اُسوقت میں بھی تھا۔ تو خدا تعالیٰ میرے ساتھ بھی ہیں۔ اگر میں تنہا بھی جہاد کو نکل کھڑا ہوں گا۔ تو خدا میری ساتھ ہے۔ انشاءاللہ میں تمام دُنیا پر غالب آؤں گا۔ کیا انتہا ہے۔ اس قوت قلب کی چنانچہ پھر سب صحابہ حضرت صدیق کی رائے پر متفق ہوگئے (اور بعد میں اقرار کیا کہ اسوقت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ہم لوگوں کو سنبھالا ورنہ ہم گمراہی میں پڑ چکے تھے کہ ان لوگوں کو مسلمان سمجھتے تھے ۱۲ ظ) اس واقعہ سے حضرت صدیق کے استقلال و قوتِ قلب کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ کہ تمام صحابہ کے اختلاف کرنے پر بھی وہ تنہا اس جماعت کے مقابلہ پر آمادہ رہے غرض صحابہ میں جو سب سے افضل تھے وہ سب سے زیادہ مستقل اور قوی القلب تھے۔ اور یہ بات تو تمام صحابہ میں تھی کہ وہ غلبہ حالات و کیفیات سے کبھی مغلوب نہ ہوتے تھے۔

؎ کتب احادیث و تاریخ سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو چکی ہے۔ کہ مانعین زکوٰۃ کے مرتد ہونے پر حضرات صحابہ نے اجماع کر لیا تھا۔ باوجودیکہ وہ اپنے کو مسلمان کہتے اور نماز پڑھتے تھے۔ اور جماعت اسلام کو چھوڑ کر کفار کی ساتھ نہ ملے تھے۔ تو یہاں سے ایک مدعی مقتدائیت اہل حدیث کی غلطی واضح ہو گئی جو اس زمانہ میں جماعت قادیانی کے متعلق اُسی نے کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ شریعت میں مرتد وہ ہے جو جماعت اسلام کو چھوڑ کر کفار میں جا ملے۔ اور جو ایسا نہ کرے بلکہ اپنے کو مسلمان کہے وہ مرتد نہیں اسلئے قادیانی جماعت مرتد نہیں کیونکہ وہ اپنے کو حلقہ بگوش اسلام کہتے ہیں میں کہتا ہوں کہ یہ جماعت بہت سے ضروریات اسلام کا صریح انکار کرتی ہے اسلئے اُسکی وہی شان ہے جو مرتدین مانعین زکوٰۃ کی تھی۔ بلکہ اس سے بڑھ کر وہ قادیانی کو نبی کہتے ہیں۔ تو اب اُس کی وہ شان ہی جو مسیلمہ کذاب کے متبعین کی تھی۔ کیونکہ مسیلمہ کذاب اور اُسکے متبعین بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت سے منکر نہ تھے۔ اور بعض لوگ گو قادیانی کو نبی نہ کہیں۔ مگر ولی اور مجدد کہتے ہیں۔ حالانکہ وہ صریح کافر ہے۔ بیشمار کفریات اُسکے اقوال میں موجود ہیں۔ اور کافر کو ولی یا مجدد کہنا بھی کفر ہے اسلئے جماعت قادیانی کے سب فرقے مرتد ہیں۔ ۱۲ ظ

اسی لئے نہ وہ کبھی وجد میں رقص کرتے تھے نہ کپڑے پھاڑتے تھے اس سے معلوم ہوا کہ یہ کپڑے پھاڑنے والے گو معذور ہوں مگر صاحب کمال نہیں کامل کو ضبط کیفیت پر پوری قدرت ہوتی ہے۔ ہمارے مشائخ میں سے حضرت شیخ عبد الحق ردولوی قدس اللہ سرہ کا ارشاد ہے

منصور بچہ بود کہ ازیک قطرہ بفریاد آمد ۔ اینجا مردانند کہ دریا ہا فرو برند و آروغ نزنند

یعنی منصور طریق سلوک میں بچے تھے کہ ایک قطرہ پیکر فریاد کرنے لگے اور جوش میں آکر انا الحق کہہ بیٹھے اور یہاں مرد ہیں کہ دریا کے دریا پی جائیں اور ڈکار تک نہ لیں ان حضرات کا دریا وجد یا رقص یا شطح کی صورت سے نہیں بہتا البتہ اُن کا دریا دوسری راہ سے نکلتا ہے۔ یعنی افادات و نفع رسانی کی راہ سے کہ وہ اپنے جوش و خروش کو طالبین کی توجہ میں صرف کرتے ہیں جس سے ہزار ہا مخلوق درجۂ ولایت پر پہنچ جاتی ہے یا اگر کبھی بہت ہی غلبہ ہوا تو اُن کا دریا آنسوؤں کی راہ سے بھی کسی وقت بہہ نکلتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

یارب چہ چشمہ ایست محبت کہ من ازاں ۔ یک قطرہ آب خوردم و دریا گرم

یہ حضرات بڑے عالی ظرف ہوتے ہیں بہت ضبط کرتے ہیں ہاں کبھی ضبط پورا نہ ہو سکا تو آنکھوں سے آنسو بہا لیتے ہیں اور یہ نقص نہیں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت تھی کہ نماز میں بعض دفعہ آپ روتے تھے تو سینے سے ایسی آواز نکلتی تھی جیسے ہنڈیا پکتی ہو۔ الغرض یہ بات ثابت ہو گئی کہ جو لوگ چلاتے پیٹتے اور کپڑے پھاڑتے ہیں وہ اہل کمال نہیں ہیں اسی لئے عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا لا تشقوا جیوبکم بل تشقوا قلوبکم ہاں صاحب حال ہیں اسی واسطے شیخ سعدی ان پر ملامت و طعن سے منع فرماتے ہیں ؎ مکن عیب درویش حیران و مست ۔ کہ غرق ست ازاں میزند پا و دست۔

کیونکہ صاحب حال معذور ہوتا ہے، مگر آج کل لوگ اسی کو کمال سمجھتے ہیں کہ بات بات پر وجد آئے رقت طاری ہو کپڑے پھاڑنے لگیں تو خوب سمجھ لو کہ یہ کمالات نہیں ہاں حالات ہیں اور حالات بھی ایسے جو مطلوب ہیں نہ مذموم کیونکہ حالات مطلوبہ تو وہی ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کے مشابہ ہوں جتنی حضور سے زیادہ

مشابہت ہوگی اُتناہی زیادہ کمال ہوگا۔ باقی کیفیات نہ ضروری ہیں نہ کمال ہیں (گو مضر بھی نہیں بلکہ اُن کا وجود علامت ہے تاثیر ذکر کی ۱۲) اسی لئے میں نے کہا تھا کہ اصل مقصود دل کا رونا ہے۔ آنکھ کا رونا اصل مقصود نہیں کیونکہ حدیث میں آچکا ہے۔ فان لم تبکوا فتباکوا ۔ اگر بکا ہی مقصود ہوتا تو رونے کی کوشش کرنا اس کا قائم مقام نہ ہوتا بہر حال ہم لوگوں کی حالت قابل اصلاح ضرور ہے اور جو لوگ گناہوں میں کم بھی مبتلا ہیں اُن کو بھی اس حالت پر تاسف ہونا چاہیئے اور جس کو تاسف نہ ہو اُسکو اس تاسف نہ ہونے پر تاسف ہونا چاہیئے۔ خاصکر جب یاد دہانی کیجائے۔ کیونکہ بعض دفعہ خود اپنی کسی حالت پر تاسف نہیں ہوتا مگر دوسرے کی تنبیہ سے خیال پیدا ہوجاتا ہے مگر خیر غنیمت ہے۔ کہ جن لوگوں کو اپنی بدحالی پر تاسف بھی نہیں ہے وہ بھی اپنی بدحالی کے مقر تو ضرور ہیں کیونکہ گنہگار ہونے کا ہر شخص کو اقرار ہے۔ تو مرض کا احساس تو سب کو ہے۔ مگر کوتاہی یہ ہے۔ کہ علاج کی فکر نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ مرض کا علاج نہ کرنا سخت خطرناک ہے تو علاج ڈھونڈنا ضروری ہوا سو اس آیت میں جسکی میں نے تلاوت کی ہے۔ اس مرض عام کا علاج موجود ہے۔ اسی لئے اسکو بیان کے لئے اختیار کیا گیا ہے۔ میں اول ترجمہ کرتا ہوں اُس کے بعد مقصود کی توضیح کروں گا حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم اُن لوگوں کی مثل نہ ہوجاؤ جو اللہ کو بھول گئے ہیں سبحان اللہ حق تعالیٰ اپنے بندوں کا کیسا لحاظ فرماتے ہیں کہ یوں نہیں فرمایا ولا تکونوا من الذین نسوا اللہ جسکا ترجمہ یہ ہوتا ہے کہ اُن لوگوں میں سے ہوجاؤ جو اللہ کو بھول گئے ہیں کیونکہ آیت کے مخاطب مسلمان ہیں اور خدا کے بھولنے والے کافر ہیں۔ حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس طرح خطاب کرنا گوارا نہیں فرمایا کہ تم خدا کے بھولنے والے نہ بن جانا بلکہ یہ فرمایا کہ دیکھو بھولنے والوں کی مشابہ نہ ہوجانا اس میں جسقدر عنایت و لطف ہے ظاہر ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ خدا کو بھول جانا تو تمہاری محبت سے بعید ہے۔ ہاں بھولنے والوں کی طرح ہوسکتے ہو تو ہم تم سے کہتے ہیں کہ تم ایسے بھی نہ ہونا اس لئے لاتکونوا کالذین نسوا اللہ دوسرے یہ بھی اس میں نکتہ ہوسکتا ہے

کہ خدا کا بالکل بھولنے والا کافر ہے۔ اور آیت کے مخاطب مسلمان ہیں اور مسلمان کافر نہیں ہو سکتا اس لیئے مسلمانوں کو لا تکونوا من الذین نسوا اللہ کے ساتھ خطاب ہو بھی نہیں سکتا۔ بلکہ اُنکو تو لا تکونوا کالذین نسوا اللہ ہی سے خطاب ہو سکتا ہے۔ اس پر مجھے حضرت مولانا یعقوب صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی بات یاد آئی مولانا فرماتے تھے کہ جو مسلمان ہوگیا وہ کافر کبھی نہیں ہو سکتا ہے اور یہ جو بعضے مسلمان آریہ وغیرہ ہو جاتے ہیں وہ حقیقت میں مسلمان ہی نہ تھے انکو ایمان نصیب ہی نہیں ہوا اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ایک شخص ظاہر میں اپنے کو مسلمان کہتا ہو اور اُس کے دل میں ایمان نہو۔ کیونکہ زبانی دعوے سے دل میں ایمان کا ہونا لازم نہیں تو ممکن ہے کہ ایک مدعی اسلام عند اللہ مسلمان نہو بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ جو لوگ مرتد ہوتے ہیں وہ عند الناس بھی مسلمان نہیں تھے۔ اور ہم لوگوں کا اُن کو مسلمان سمجھنا محض حسن ظن پر مبنی تھا کہ نیک گمان کی وجہ سے ہم نے اُن کی حالت میں غور نہیں کیا۔ اور اگر دعوئے اسلام کی حالت ہی میں اُن کے اقوال و افعال کو غور سے دیکھا جاتا تو ہم کو بھی معلوم ہو جاتا کہ اُن کو ایمان نصیب نہیں ہوا چنانچہ میں آپ کو ایک عجیب عبرت انگیز حکایت سُناتا ہوں جو میں نے مولانا فتح محمد صاحب رحمتہ اللہ علیہ سے سُنی تھی مولانا فرماتے ہیں کہ شیخ محمد (تاجر روغن) نے جو مکہ کے ایک بڑے عالم تھے۔ فرمایا کہ مکہ میں ایک عالم کا انتقال ہوا اور اُن کو دفن کر دیا گیا۔ کچھ عرصے کے بعد کسی دوسرے شخص کا انتقال ہوا تو اُس کے وارثوں نے اُن عالم صاحب کی قبر میں اُن کو دفن کرنا چاہا مکہ میں یہ دستور ہے کہ ایک قبر میں کئی کئی مردوں کو دفن کر دیتے ہیں چنانچہ اُن عالم صاحب کی قبر کھودی گئی۔ تو دیکھا کہ اُن کی لاش کی بجائے ایک نہایت حسین لڑکی کی لاش رکھی ہوئی ہے۔ اور صورت دیکھنے سے وہ لڑکی یورپین معلوم ہوتی تھی۔ سب کو حیرت ہوئی کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ اتفاق سے اُس مجمع میں یورپ سے آنے والا ایک شخص بھی موجود تھا اُس نے جو لڑکی کی صورت دیکھی تو کہا میں اس کو پہچانتا ہوں یہ لڑکی فرانس کی رہنے والی اور ایک عیسائی کی بیٹی ہے۔ یہ مجھ سے اُردو پڑھتی تھی۔ اور در پردہ مسلمان ہو گئی تھی میں نے

اُسکو دینیات کے چند رسالے بھی پڑھائے تھے۔ اتفاق سے بیمار ہوکر انتقال کر گئی۔ اور میں دل برداشتہ ہوکر نوکری چھوڑ کر یہاں چلا آیا۔ لوگوں نے کہا کہ اسکے یہاں منتقل ہونے کی وجہ تو معلوم ہو گئی کہ مسلمان اور نیک تھی۔ لیکن اب یہ بات دریافت طلب ہے کہ اُن عالم صاحب کی لاش کہاں گئی بعض لوگوں نے کہا کہ شاید عالم کی لاش اس لڑکی کی قبر میں منتقل کر دی گئی۔ اُسپر لوگوں نے اس سیاح سے کہا کہ تم حج سے واپس ہوکر یورپ جاؤ تو اس لڑکی کی قبر کھود کر ذرا دیکھنا کہ اُس میں مسلمان عالم کی لاش ہے یا نہیں اور کوئی صورت شناس بھی ساتھ کر دیا۔ چنانچہ وہ شخص یورپ واپس گیا اور لڑکی کے والدین سے اُس کا یہ حال بیان کیا۔ اُسپر اُن کو بڑی حیرت ہوئی کہ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ لڑکی کو دفن تو کیا جائے فرانس میں اور تم اُسکی لاش مکّہ میں دیکھو تو اخیر رائے یہ قرار پائی کہ اس لڑکی کی قبر کو کھودو۔ چنانچہ اُسکے والدین اور چند لوگ اس حیرت انگیز معاملہ کی تفتیش کے لئے قبرستان پہنچے اور لڑکی کی قبر کھودی گئی تو واقعی اسکے تابوت میں اُسکی لاش نہ تھی بلکہ اُسکے بجائے وہ مسلمان عالم مقطع صورت وہاں دھرے ہوئے تھے جن کو مکّہ میں دفن کیا گیا تھا۔ شیخ دہّان نے فرمایا کہ اُس سیاح نے کسی ذریعہ سے ہم کو اطلاع دی کہ اُس عالم کی لاش یہاں فرانس میں موجود ہے۔ اب مکّہ والوں کو فکر ہوئی کہ لڑکی کا مکّہ پہونچ جانا تو اُسکے مقبول ہونے کی علامت ہے اور اُسکے مقبول ہونے کی وجہ بھی معلوم ہو گئی مگر اُس عالم کا مکّہ سے کفرستان میں پہونچ جانا کس بنا پر ہوا اُسکے مردود ہونے کی کیا وجہ ہے سب نے کہا کہ انسان کی اندرونی حالت گھر والوں کو معلوم ہوا کرتی ہے۔ اُسکی بی بی سے پوچھنا چاہیئے چنانچہ لوگ اُس کے گھر گئے اور دریافت کیا کہ تیرے شوہر میں اسلام کے خلاف کوئی بات تھی اُس نے کہا کچھ بھی نہیں وہ تو بڑا نمازی اور قرآن کا پڑھنے والا تہجد گزار تھا لوگوں نے کہا سوچکر بتلاؤ کیونکہ اُسکی لاش دفن کے بعد مکّہ سے کفرستان میں پہونچ گئی ہے۔ کوئی بات اسلام کے خلاف اُس میں ضرور تھی اُسپر بی بی نے کہا ہاں میں اُسکی ایک بات پر ہمیشہ کھٹکتی تھی وہ یہ کہ جب وہ مجھسے مشغول ہوتا اور فراغت کے بعد غسل کا ارادہ کرتا تو یوں کہا کرتا تھا کہ نصاریٰ

کے مذہب میں یہ بات بڑی اچھی ہے کہ اُنکے یہاں غسل جنابت فرض نہیں لوگوں نے کہا بس یہی بات ہے جس کی وجہ سے خدا تعالیٰ نے اُسکی لاش کو مکہ سے اُسی قوم کی جگہ پھینکدیا جن کے طریقے کو وہ پسند کرتا تھا۔ حضرت آپ نے دیکھا کہ یہ شخص ظاہر میں عالم متقی اور پورا مسلمان تھا مگر تفتیش کے بعد معلوم ہوا کہ اُس میں ایک بات کفر کی موجود تھی کہ وہ کفار کے ایک طریقے کو اسلامی حکم پر ترجیح دیتا تھا اور استحسان کفر کفر ہے۔ اسلئے وہ شخص پہلے ہی سے مسلمان نہ تھا۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر جگہ لاش منتقل ہو جایا کرے۔ مگر خدا تعالیٰ کہیں ایسا بھی کر کے دکھلا دیتے ہیں تاکہ لوگوں کو عبرت ہو کہ بدحالی کا نتیجہ یہ ہے اسلئے میں کہتا ہوں کہ جو کافر ہوتا ہے اُس میں اول ہی سے کوئی بات کفر کی ہوتی ہے جو تفتش اور غور کے بعد ہم کو بھی معلوم ہو سکتی ہے۔ مگر ہم غور نہیں کرتے اسلئے کہدیتے ہیں کہ مسلمان آریہ ہو گیا حالانکہ وہ پہلے ہی سے آریہ تھا اُس میں اسلام تھا ہی نہیں مگر ہم کو اُس کی بدحالی کا علم نہ تھا ورنہ جو مسلمان ہو گا وہ کبھی کافر نہیں ہو سکتا اسی لیے شیطان کے بارے میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وکان من الکفرین کہ وہ پہلے ہی کافروں میں سے تھا سجدۂ آدم علیہ السلام سے انکار کرنیکے وقت ہی کافر نہیں ہوا جسکا راز اہل تحقیق نے اسطرح فرمایا ہے۔ کہ ؎

در لوح بُد نوشتہ کہ ملعون شود یکے ـــ بردم گمان بہر کس و بر خود گمان نبود
آدم ز خاک بود و من از نور پاک او ـــ گفتم منم یگانہ و او خود یگانہ نبود

یعنی لوح محفوظ میں پہلے ہی سے لکھا ہوا تھا کہ آدم علیہ السلام کی پیدائش کے وقت ایک شخص کافر ہوگا (یعنی اُس وقت اُس کا کفر ظاہر ہوگا ۱۲) اور شیطان لوح محفوظ کو پڑھکر اس واقعہ سے باخبر تھا کہ ایک شخص کافر ہونیوالا ہے۔ مگر اسکو کبھی اپنے متعلق یہ احتمال نہ ہوا کہ شاید وہ میں ہی ہوں وہ اپنی طاعت و عبادت کی وجہ سے بیفکر تھا کہ بھلا اتنا بڑا عابد کبھی کافر ہو سکتا ہوں ہرگز نہیں یہ کوئی اور شخص ہوگا اس تکبر اور بیفکری ہی نے اسکو تباہ کیا (ورنہ ملائکہ کی یہ حالت تھی کہ اس خبر کو دیکھ کر سب کے سب ڈر رہے تھے کہ دیکھئے کس کی کمبختی آنیوالی ہے۔ اس تواضع اور خشیت ہی سے وہ مقبول و مکرم رہے ہیں ۱۲)

حاصل راز کا یہ ہوا کہ اُسکا عجب و پندار اس بھی کفر کی اور وہ اُس میں پہلے ہی سے تھا جسکے لئے مردودیت لازم ہے۔ غرض شیطان پہلے ہی سے مقبول نہ تھا۔ اس لیئے مردود ہو گیا ورنہ جو مقبول ہو جاتا ہے وہ کبھی مردود نہیں ہوتا جیسے بالغ کبھی نابالغ نہیں ہوتا مگر یہ بھی خبر ہے کہ بالغ کون ہے۔ ہر زبان سے دعویٰ اسلام کرنیوالا بالغ نہیں بلکہ بالغ وہ ہے۔ جسکو مولانا فرماتے ہیں۔ ؎

خلق اطفالند جز مستِ خُدا　　　نیست بالغ جز رہیدہ از ہوا

یعنی جس نے اسلام کے بعد حکم الٰہی کے سامنے اپنی ہوا و ہوس کو فنا کر دیا ہو وہ بالغ ہے۔ باقی سب نابالغ ہیں۔ پس جو شخص اسلام سے مرتد ہو کر اپنا نابالغ ہونا ظاہر کرتا ہے۔ وہ ابھی تک بالغ ہوا ہی نہ تھا بلکہ اُس وقت تک نابالغ تھا۔ حدیث میں بھی تو ہے کہ ہرقل نے حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ سے اُنکے اسلام لانے سے پہلے دریافت کیا تھا۔ کہ کیا اس دین کو اختیار کرکے کوئی شخص کراہت کے ساتھ اُسکو چھوڑتا بھی ہے حضرت ابوسفیان نے کہا نہیں ہرقل نے اسپر کہا وکذالک الایمان اذا خالط بشاشۃ القلوب یعنی ایمان کی یہی حالت ہوتی ہے۔ کہ جب وہ قلوب میں پیوستہ ہو جاتا ہے پھر نہیں نکلتا کیونکہ ایمان ایک عشق ہے۔ اور عشق اگر سچا ہو تو کبھی دل سے نہیں نکلتا حتیٰ کہ مرنیکے بعد بھی نہیں نکلتا جیسے کہ اگر کسیکو غیر اللہ سے محبت ہو جاتے تو وہ بھی مرکر نہیں جاتی اسی کو کہا ہے۔ ؎

رفتم اندر تہ خاک　　　انسِ بتاتم باقی ست

اسی لئے اہل اللہ اپنے دل میں کسی جائز محبت کو بھی جمنے نہیں دیتے۔ کیونکہ مرنیکے وقت اُس محبوب کا خیال آوے گا۔ اور اُن کا اصل مدعا یہ ہے کہ جب دُنیا سے جاویں تو اُس وقت کسی کی محبت بجز خدا و رسول کے دل میں نہو اہل اللہ نے تو جنت کی بھی رغبت نہیں کی حضرت عمر بن الفارض رضی اللہ عنہ کا جب انتقال ہونے لگا تو آٹھوں جنتیں اُنکے سامنے کر دی گئیں۔ اُنھوں نے منہ پھیر لیا اور یہ شعر پڑھا۔ ؎

ان کان منزلتی فی الحب عندکم　　　ماقد رایت فقد ضیعت ایامی

اگر آپکے نزدیک میری محبت کی یہی قدر ہے۔ جو میں دیکھ رہا ہوں تو میں نے اپنے دن ہی ضائع کئے

ساری عمر یوں ہی برباد گئی مجبت الجنان وتجلی له الرب تعالیٰ وطار روحه فرحا به بس اُسی وقت جنتیں چھپا دی گئیں۔ اور حق تعالیٰ کی خاص تجلی ہوئی اور اُسکے ساتھ ہی جان نکل گئی اور بالکل وہ حالت ہو گئی ؎

گر نکیر آید و پرسد که بگو رب تو کیست　　گویم آنکس که ربود ایں دلِ دیوانهٔ ما

اور جان نکلنے کے قریب یہ حالت تھی ؎

گر بیاید ملک الموت که جانم ببرد　　تا نه بینم رُخِ تو روح رمیدن ندہم

واقعی عمر بن الفارض رح نے تو یہ کرکے دکھلا دیا کہ بدون تجلی آلہی کے جان ہی ندی جب ان حضرات کو جنت پر بھی توجہ نہیں ہوتی تو دوسروں کی طرف تو کیا التفات ہوگا۔ مگر یہ تو صاحبِ حال تھے۔ اُنکو جنت سے مُنہ پھیرنیکا حق تھا۔ ہم کو بدون اس حال کے ایسا دعوےٰ نہ چاہیئے ہم کو تو اگر وہاں دُنیا کی روٹی بھی مل جائے تو غنیمت ہے بعض لوگ اکثر ڈینگیں مارا کرتے ہیں کہ ہم کو جنت کی کیا پروا ہے۔ ہم کو حوروں کی کیا پروا ہے یہ نہایت سخت بات ہے۔ ہر شخص کا مُنہ اس بات کے قابل نہیں ؎

ناز را روی بباید ہمچو ورد　　چوں نداری گرد بدخوئی مگرد

زشت باشد روی نازیبا و ناز　　عیب باشد چشم نابینا و باز

اور ؎ پیشِ یوسف نازش و خوبی مکن　　جز نیاز و آہِ یعقوبی مکن

چوں تو یوسف نیستی یعقوب باش　　ہمچو او با گریہ و آشوب باش

غرض ہم لوگ اہل نیاز ہیں ہم کو ناز نہ چاہیئے بلکہ احتیاج ظاہر کرنا چاہیئے۔ جو لوگ جنت سے لاپروائی کی ڈینگیں مارتے ہیں اُن کو چار دن روٹی نہ ملے تو حقیقت کُھل جائے اُسی وقت لوگوں سے قرض ادھار یا خیرات مانگنے لگیں تو جسکو چار روٹیوں سے بھی استغنا نہو اُسکو جنت سے لاپروائی کا دعویٰ کب زیبا ہے۔ خیر وہ تو صاحبِ حال تھے۔ مگر ہے یہی بات کہ محبت مرتے دم تک بلکہ مرنیکے بعد بھی دل سے نہیں نکلتی اسلئے اہل اللہ جائز محبت سے بھی بچتے ہیں ہم اگر ایسا نکر سکیں تو کم از کم حرام محبت سے تو بچنا چاہیئے۔ اس واقعہ سے یہ بات تو معلوم ہوگئی کہ حق تعالیٰ کے چاہنے والوں کی یہ حالت ہوا

کرتی ہے۔ کہ وہ مرتے وقت بجز جمالِ محبوب کے اور کسی خیال میں نہیں ہوتے واقعی جینا اور مرنا اُنہی کا ہے اور اگر ہم بھی اُنکے ساتھ وابستہ ہوجائیں تو انشاء اللہ یہ دولت ہم کو بھی حاصل ہوجائے گی۔ اور ہم بھی مرتے وقت ایسے ہی ہوں گے لیکن اگر یہ بات ہو تو ایسا تو ہونا چاہیئے کہ اس وقت کوئی ناجائز محبت دل میں نہ ہو۔ اور اس کا طریقہ یہی ہے۔ کہ زندگی میں محبت حرام سے بچو اگر زندگی میں اس میں ابتلاء ہوگیا۔ تو مرتے وقت بھی وہ ساتھ رہے گی غرض عشق خواہ حلال ہو یا حرام دل سے کبھی نہیں نکل سکتا اسی لئے ہرقل نے کہا تھا کہ ایمان دل میں رچ جانیکے بعد نہیں نکلا کرتا کیونکہ ایمان نام ہے عشق خداوندی کا چنانچہ نص والذین آمنوا اشد حبا للہ اُس کی کافی دلیل ہے پس حاصل یہ ہے آیت میں تشبیہ کے اختیار کرنے کے دوسرے نکتہ کا یعنی چونکہ مخاطب مسلمان ہیں اسلئے وہ خطاب ولا تکونوا من الذین نسوا اللہ کے محل نہیں ہوسکتے یعنی وہ کبھی خدا کو دل سے بالکل بھلا نہیں سکتے اس واسطے حق تعالیٰ نے ولا تکونوا کالذین نسوا اللہ فرمایا اور اس میں بہ نسبت نکتہ اولیٰ کے زیادہ مبالغہ ہوا کیونکہ اُس نکتہ اولیٰ کا حاصل یہ تھا کہ مسلمان کا خدا کو بھول جانا بعید ہی لیکن بھول سکتا ہے۔ مگر حق تعالیٰ نے پھر بھی عنایت وشفقت کی بناء پر یہ نہیں فرمایا کہ تم ہم کو بھولنا بلکہ یہ فرمایا کہ بھولنے والوں کی طرح نہ ہونا۔ اور دوسرے نکتہ کا حاصل یہ ہوا کہ مسلمان کا خدا کو بھول جانا ممکن ہی نہیں۔ کیونکہ بالکل بھول جانا کافر کا کام ہے اور مسلمان کافر نہیں ہوسکتا ۱۲) آگے ارشاد ہے۔

فانسٰھم انفسھم کہ جب وہ خدا کو بھول گئے تو خدا تعالیٰ نے اُن کے نفسوں کو بھی اُن کو بھلا دیا۔ یہاں ایک نکتہ ہے گو ظاہر کرنے کو جی نہیں چاہتا مگر خیر دل میں آئی ہوئی بات کو کیوں روکوں شاید کسی کو نفع ہوجائے وہ نکتہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے دوسری جگہ فرمایا ہے ونحن اقرب الیہ من حبل الورید کہ ہم انسان کی جان سے بھی زیادہ اسکے قریب ہیں تو جو شخص جان سے زیادہ قریب کو بھول جائے تو ممکن نہیں کہ وہ اپنے کو یاد رکھے حقیقت میں خدا کو بھولنے والا اپنے آپ کو بھی بھولا ہوا ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ جو اپنے آپ کو بھی بھول گیا اُسکو تو مقام فنا حاصل ہوا تو جواب یہ ہے کہ بعضے

ایسی فنا پر فنا کے معنے یہ ہیں کہ خدا کی یاد میں اتنا مستغرق ہو کہ اپنے کو بھول جاوے عـــہ نہ یہ کہ خدا کو بھلا کر اپنے آپ کو بھولے۔ اور اگر کوئی یہ کہے کہ خدا کو بھول کر ہم اپنے کو کہاں بھولتے ہیں اپنی یاد تو پھر بھی رہتی ہے۔ تو پہلے یہ سمجھو کہ یاد کے معنے کیا ہیں یاد مطلوب وہ ہے جو نافع ہو اور جو محبت کے ساتھ ہو چنانچہ یہ محاورہ بھی تو ہے کہ دوستوں سے کہا کرتے ہیں کہ بھائی ہم کو یاد رکھنا اس سے مراد یہی ہوتی ہے۔ کہ محبت کی ساتھ یاد رکھنا یہ کسی کا مطلب نہیں ہوتا کہ بس جس طرح سے بھی ہو یاد رکھنا خواہ روزانہ دو چار پیزار ہی لگا دیا کرنا۔ اور اگر وہ آکر دو چار پیزار لگا دیا کرے اور یہ کہے کہ تم نے یاد کرنے کو کہا تھا میں یاد ہی تو کرتا ہوں تو اُسکو ہرگز یاد نہیں کہا جاسکتا غرض محاورہ میں بھی محبت ہی کی یاد کو یاد رکھتے ہیں دشمنی اور ضرر رسانی کی یاد کو یاد نہیں کہا کرتے اب سمجھیے کہ جس وقت کسی نے اپنے خدا کو بھلا دیا تو اُس نے اپنے تمام مصالح کو فوت کر دیا اب اُس کو یہ یاد نہیں رہا کہ میرے نفس کی فلاح کا طریقہ کیا ہے تو حقیقت میں وہ اپنے کو بھول گیا اور اب اُسکو اپنی یاد ایسی ہوگی جیسے کوئی کسی کے روزانہ دو چار جوتے مار کر یہ کہے کہ میں تجھکو یاد کرتا ہوں غرض جو شخص خدا تعالیٰ کو بھولے گا وہ اپنے کو بھی ضرور بھول جاوے گا اسی طرح جو خدا کو یاد رکھے گا وہ اپنے کو بھی یاد رکھے گا مگر مستقلاً نہیں بلکہ اس طرح کہ میں خدا کی چیز ہوں خدا تعالیٰ کے ساتھ مجھے تعلق ہے اور جو کچھ میرے پاس ہے سب خدا کی امانت ہے وہ کسی چیز کو بلا واسطہ خدا تعالیٰ کے یاد نہ کرے گا بلکہ جیسے عاشق کو محبوب کی سب چیزیں یاد رہتی ہیں اور اُن کی یاد حقیقت میں محبوب ہی کی یاد ہوتی ہے۔ اسی طرح وہ اپنے کو بھی اور اپنی متعلقات کو بھی اسی حیثیت سے یاد کرتا ہے۔ کہ یہ سب محبوب ہی کی چیزیں ہیں یہ ایسی بات ہے جیسے ہل یا تھا اور بیل کی حفاظت ایک تو مالک کرتا ہے۔ وہ تو اپنی چیز سمجھکر اُنکی حفاظت کرتا ہے اور ایک نوکر حفاظت کرتا ہے

عـــہ اور درحقیقت خدا کی یاد میں اپنے کو بھولنے والا واقع میں بھولنے والا نہیں ہے بلکہ اپنے کو یاد رکھنے والا ہے گو درجۂ التفات میں بھولا ہوا ہے۔ چنانچہ یاد کے معنے معلوم کرکے ابھی یہ حقیقت واضح ہو جائے گی ۱۲ ظ

وہ اپنی چیز سمجھکر نہیں کرتا بلکہ دوسرے کی چیز سمجھکر ان کی حفاظت کرتا ہے۔ اہل اللہ اپنی ذات یا اپنے ہاتھ پاؤں اور تمام متعلقات کی حفاظت نوکر کی طرح کرتے ہیں مالک کی طرح نہیں کرتے ہم تو کھاتے ہیں اپنا پیٹ بھرنے کے لئے اور وہ سرکاری مشین کی حفاظت کے لئے کھاتے ہیں اور یہاں سے لا تقتلوا انفسکم کا راز بھی سمجھ میں آگیا ہوگا۔ کہ حق تعالیٰ نے قتل نفس سے اس لئے منع فرمایا ہے کہ یہ آپ کی جان اُنہی کی ملک ہے تمہاری ملک نہیں ہم سب خدا ہی کی چیز ہیں اس لئے اُنہوں نے اپنی چیز میں بدون اجازت کے تصرف کرنے سے منع فرمادیا اور اسی مرتبہ میں حکم ہے ان لجسدک علیک حقا وان لنفسک علیک حقا وان لعینیک علیک حقا بس کسی کو یہ حق نہیں کہ کوئی دوا، بارد کھا کر نامرد ہو جائے۔ یا آنکھوں میں گرم سلائی لگا کر اندھا ہو جائے۔ عارفین پر چونکہ یہ راز منکشف ہو گیا ہے۔ اسلئے وہ اپنی جان کو سرکاری چیز سمجھکر اُس کی خوب حفاظت کرتے ہیں اور اسی نیت سے بعض دفعہ عمدہ غذا اور عمدہ لباس بھی استعمال کرتے ہیں لوگ اُس کو تن پروری سمجھتے ہیں مگر نہیں وہ اس سے بہت دور ہیں لیکن ؎

در نیابد حال پختہ ہیچ خام   پس سخن کوتاہ باید والسلام

ایک دفعہ ہمارے حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہ نے فرمایا کہ میاں اشرف علی پانی جب پیو خوب ٹھنڈا پیا کہ ہر بُن مُنہ سے الحمد للہ نکلے گا۔ اور گرم پانی پینے میں زبان سے تو الحمد للہ کہو گے مگر دل شریک نہ ہوگا (آپ نے دیکھا کہ لذائذ کے استعمال میں عارفین کی کیا نیت ہوتی ہے۔ عام لوگ تو ٹھنڈا پانی اس غرض سے پیتے ہیں کہ مزا آئے گا پیاس کو تسکین ہوگی۔ اور عارف اس لئے پیتا ہے کہ ہر بُن مُنہ سے حق تعالیٰ کی حمد نکلے گی۔ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا ۱۲) اور اسی راز کے منکشف ہونے پر ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است   افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است
ہردم ہزار بوسہ زنم دست خویش را   کو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

اپنی آنکھوں پر ناز کرتے ہیں کیونکہ اُس نے سرکاری کام کیا ہے اُس نے محبوب کے جمال کو دیکھا ہے

(اور اسی سے محبوب کے کلام کو دیکھکر تلاوت کی توفیق ہوئی ہے۔ اپنے ہاتھ پاؤں کو بوسہ دیتے ہیں مگر اُسی سرکاری تعلق کی وجہ سے کہ ان سے نماز پڑھی۔ خدا کے راستہ میں چلنا نصیب اور بہت سے کام رضائے محبوب کے واسطے اُن سے ہوئے گئے۔ اس لئے فرماتے ہیں کہ میں اپنے ان اعضاء پر جان دیتا ہوں اور ان کی قدر کرتا ہوں۔ مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی رح فرماتے تھے کہ میں مکہ معظمہ میں ایک بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا لوگ اُنکے منہ پر اُنکی تعریف کر رہے تھے اور وہ خوش ہو رہے تھے۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہ کیسے بزرگ ہیں جو اپنی تعریف سے مزے لے رہے ہیں اُن کو اس خطرہ کی اطلاع ہو گئی فوراً جواب دیا کہ یہ میری تعریف تھوڑی ہی ہے۔ میرے محبوب کی تعریف ہے۔ کیونکہ ہمارا کمال سب اُدھر سے ہی ہے مصنوع کی تعریف حقیقت میں صانع کی تعریف ہے۔ کہ اُن نے کس خوبی سے اس چیز کو بنایا ہے اسلئے میں اپنے محبوب کی تعریف پر خوش ہو رہا ہوں وہ کہنے لگے کہ مجھے پھر خطرہ ہوا کہ جب یہی بات ہے تو میرا یہ خطرہ بھی محبوب ہی کی طرف سے تھا اسپر اتنی ناگواری کیوں ہوئی اُنکو اسپر بھی اطلاع ہو گئی فرمایا محبوب کی طرف بری باتوں کی نسبت کرنا بے ادبی ہے اب تو میں بڑا گھبرایا کہ یہاں تو دل کو سنبھال کر بیٹھنا چاہیئے یہ تو ہر خطرے پر مطلع ہو جاتے ہیں۔ واقعی اہل اللہ کے پاس بیٹھکر بُرے خیالات سے دل کی حفاظت کرنا چاہیئے کیونکہ انکو گاہے خطرات پر بھی اطلاع ہو جاتی ہے جس سے اُنکو ایذا ہوتی ہے۔

پیش اہل دل نگہدارید دل   تا نباشید از گمان بد خجل

اسپر یہ شبہ ہو گا کہ بعضے خطرات تو بے اختیار آتے ہیں اُن سے کیونکر حفاظت کیجائے بس اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ اہل اللہ کے پاس بیٹھنا ہی نہ چاہیئے تو سمجھ لیجئے کہ جنکو خطرات کی اطلاع ہوتی ہے۔ اُنکو اللہ تعالے یہ بھی معلوم کرا دیتا ہی کہ یہ اختیاری ہے اور یہ غیر اختیاری ہے اور وہ ایسے نہیں ہوتے کہ غیر اختیاری امور پر مواخذہ کریں اور نہ غیر اختیاری خطرات سے اُنکو ایذا ہوتی ہے پس نگہدارید دل کے معنے یہ ہیں کہ اختیاری خطرات سے اُن کے پاس بیٹھکر دل کی حفاظت کرو۔ غرض واقع میں ہم اپنے نہیں ہیں بلکہ خدا تعالے کے ہیں

تو جو خدا کو یاد کرے گا وہ اپنے کو اسطرح یاد کرے گا کہ اُسکی نظر اول خدا پر پڑے گی پھر اپنے پر (اور یہ التفات الی الغیر نہیں ہے) اسکی ایسی مثال ہے جیسے ایک حسین شخص کے گھر میں آئینہ رکھا ہو جس میں اُس کی صورت نظر آرہی ہو اور ایک عاشق بھی وہاں بیٹھا ہوا ہے۔ جو محبوب کی طرف رعبِ جمال کی وجہ سے نگاہ اُٹھا کر نہیں دیکھ سکتا اسلئے وہ آئینے میں اُسکی صورت دیکھ رہا ہے۔ اور ایک دوسرا شخص ہے جو عاشق نہیں وہ بھی اُس آئینے کو دیکھ رہا ہے مگر اس نیت سے کہ دیکھوں یہ آئینہ حلبی ہے یا چینی ہے تو یہ دونوں شخص آئینے کے دیکھنے میں شریک ہیں مگر دونوں کے دیکھنے میں زمین آسمان کا فرق ہے ؎

بحرِ تلخ و بحرِ شیریں ہمعناں　　　　درمیاں شان برزخ لایبغیان

ظاہر میں دونوں یکساں معلوم ہوتے ہیں مگر حقیقت میں الگ الگ ہیں عاشق کی نظر اول محبوب کی تصویر پر پڑے گی۔ گو تبعاً آئینہ پر بھی نظر ہے۔ اور غیر عاشق کی نظر اول آئینہ پر پڑے گی گو تبعاً حسین کی تصویر بھی نظر پڑ جائے مگر اُس کا مقصود حسین کی تصویر دیکھنا نہیں ہے۔ بلکہ صرف آئینہ کی خوبی دیکھنا مدِ نظر ہے۔ اسی طرح عارف بھی مخلوقات کو دیکھتا ہے اور ہم بھی دیکھتے ہیں مگر بڑا فرق ہے۔ اُس کی نظر اول خدا تعالیٰ پر پڑتی ہے پھر تبعاً مخلوق بھی اُسکے سامنے ہے اور ہماری نظر اول مخلوق پر پڑتی ہے۔ گو تبعاً حق تعالیٰ کی قدرت و صنعت کا بھی خیال آجائے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا رتبہ تو یہاں تک ہے کہ اُن سے پوچھا گیا هل عرفت ربك بمحمد ام عرفت محمدا بربك کہ اپنے حق تعالیٰ کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے پہچانا یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کے واسطے سے پہچانا تو فرمایا عرفت محمدا بربی کہ میں نے تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کے واسطے سے پہچانا اگر آج کوئی شخص یہ بات کہدے تو بس کفر ہو گیا۔ بجائے قدر کرنے کے غریب پر چاروں طرف کفر کے فتوے لگنے لگیں گے کیونکہ حقیقت شناس دُنیا سے اُٹھ گئے چنانچہ ایک شخص نے میرے ایک دوست سے کہا کہ تم جو توحید کے مضامین زیادہ بیان کرتے ہو کہ حق تعالیٰ کے افعال میں نہ کسی ولی کو دخل ہے نہ نبی کو وہاں کوئی دخیلکار نہیں ہے وغیرہ وغیرہ) اس سے حضور کی بے تعظیمی ہوتی ہے۔ اُنہوں نے کہا تو یہ ہم حضور کی تعظیم سے تھوڑا ہی

روکتے ہیں بلکہ خدا کی توہین سے روکتے ہیں کہ حضور کو اتنا نہ بڑھاؤ کہ حق تعالیٰ کو گھٹا دو غور کرکے دیکھا جائے تو جو لوگ حضور کے لئے صفات الوہیت ثابت کرتے ہیں حقیقت میں وہ آپکی بے تعظیمی کرتے ہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ صفات الوہیت درجۂ کمال میں تو آپ کے لئے ثابت کر نہیں سکتے لامحالہ درجۂ نقصان میں ثابت کریں گے تو انہوں نے حضور کو ناقص قرار دیا اور ہم آپ کے لئے صفات الٰہیہ کو ثابت نہیں کرتے بلکہ انکی نفی کرکے صرف صفات بشریہ اور کمالات نبوت کو آپ کے لئے ثابت کرتے ہیں اور ان میں سے ہر صفت کو درجۂ کمال میں ثابت کرتے ہیں تو ہم آپکو بشر کامل و رسول کامل کہتے ہیں کسی نے خوب کہا ہے کہ اگر عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کہوگے تو ناقص خدا کہوگے۔ اور ہم انسان کہتے ہیں مگر کامل انسان تو بتلاؤ بے تعظیمی کس نے کی بے ادب وہ ہے جو آپ کو ناقص کہے یا وہ جو کامل کہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا سے گھٹانا بھی بے ادبی ہے تو پھر حضرت صدیق اکبر کو کیا کہیئے گا جو یوں کہتے ہیں کہ میں نے اول خدا کو جانا پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے خدا کو نہیں پہچانا۔ غرض یہ ثابت ہوگیا کہ عارف کی نظر اول خدا پر پڑتی ہے۔ پھر اپنے پر تو معلوم ہوا کہ خدا قریب ہے۔ اور نفس دور ہے (اگر خدا تعالیٰ نفس سے قریب تر نہوتے تو کسی کی نظر بھی اولاً ان پر نہ پڑسکتی ۱۲) تو لازم آگیا کہ جو خدا کو بھول گیا وہ اپنے نفس کو بھی بھول گیا اسی کا بیان ہے۔ فانسٰهم انفسهم میں آگے فرماتے ہیں اولٰئک هم الفاسقون یہ ہے جزو مقصود جس سے مجھکو بدحالی مذکور سابقا کا علاج مستنبط کرنا ہے۔ ترجمہ یہ ہے کہ یہ لوگ ہیں حکم سے نکل جانے والے۔ اس میں اولئک اسم اشارہ ہے جسکے لئے فاسقون کا حکم ثابت کیا گیا ہے اور بلاغت کا قاعدہ ہے کہ اسم اشارہ میں مشار الیہ کا مع صفات مذکورہ کے اعادہ ہوتا ہے اور حکم کی بنا انہی صفات پر ہوتی ہے۔ جو پہلے مذکور تھیں (چنانچہ اولٰئک علی هدی من ربهم واولٰئک هم المفلحون کی تفسیر میں مفسرین نے اسکی تصریح کی ہے کہ اسم اشارے سے اس جگہ یہ بات تبلائی گئی ہے۔ کہ ہدایت وفلاح کا حکم صفات مذکورہ ایمان بالغیب واقامۃ صلوٰۃ وتصدیق کتب منزلہ وانفاق مال وغیرہ پر مبنی ہے۔ اوران صفات کو حکم فلاح میں دخل ہے ۱۲)

اس قاعدے کی بناء پر یہاں بھی اولئک میں صفت نسیان کا اعادہ ہوگا جو پہلے الذین نسوا اللہ
میں مذکور ہو چکی ہے اور حکم فسق کی بنا اسی صفت پر ہوگی خلاصہ یہ کہ آیت میں نسیانِ خدا پر فسق
کو مرتب کیا گیا ہے۔ تو یہ سبب ہوا فسق کا یعنی حکم سے نکل جانے کا اور حکم سے نکل جانا یہی
حقیقت ہے معصیت کی جس میں ہم مبتلا ہیں تو الحمد للہ آیت سے صاف طور پر سببِ مرض
کی تشخیص ہو گئی اور معلوم ہو گیا کہ ہماری بدحالی کا سبب یہ ہے کہ ہم خدا کو بھول گئے ہیں اور
طبی قاعدہ ہے العلاج بالضد (جو کہ عقل و شرع سے بھی مؤید ہے) چنانچہ سب جانتے ہیں کہ
مرض حرارت سے ہو تو علاج برودت سے کیا جاتا ہے۔ برودت سے ہو تو حرارت سے علاج
کیا جاتا ہے تو اسیطرح یہاں بھی علاج بالضد ہونا چاہیئے اور نسیان کی ضد ذکر ہے۔
تو معصیت کا علاج ذکر اللہ ہوا یا یوں کہیئے کہ ہر مرض کا علاج رفع سبب ہوتا ہے (خواہ
ضد کے ذریعہ سے رفع کیا جائے یا مثل کے ذریعہ سے مگر ازالہ مرض کیلئے رفع سبب
سب کے نزدیک ضروری ہے ۱۲) اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ مرض عصیان کا سبب نسیان ہے
تو اس کا علاج یہ ہوا کہ نسیان کو اٹھا دو اور رفع نسیان مستلزم ہے وجود ذکر کو (کیونکہ ارتفاع
نقیضین محال ہے ۱۲) تو حاصل پھر وہی ہوا کہ معصیت کا علاج خدا کو یاد رکھنا ہے۔ اب میں بیان
کو مختصر کرتا ہوں اور ایک بہت بڑے مضمون کو تھوڑے لفظوں میں بیان کرتا ہوں گو جی نہ
بھرے مگر انشاء اللہ بقدر کفایت تسلی ہو جائے گی۔ ایک دوست کا خط آیا تھا کہ تمہارے
جوابات سے جی نہیں بھرتا کیونکہ میں لمبے لمبے مضامین کا جواب دو چار سطروں میں دیدیتا
ہوں تو میں نے لکھا کہ گو جی نہیں بھرتا مگر تسلی تو ہو جاتی ہے۔ اور چند جملوں میں آپ کی سب باتوں
کا کافی جواب تو ہو جاتا ہے۔ اس کا انہوں نے اقرار کیا میں نے کہا بس یہی کافی ہے جی بھرنے
کی ضرورت نہیں (جسکو جی بھرتا ہو وہ پاس آکر رہے۔ اگر میں خطوط میں مخاطب کے جی بھرنے
کی کوشش کروں تو بس دن بھر میں دو چار خطوں کا جواب ہوا کرے اور میں یہ چاہتا
ہوں کہ روزانہ کی ڈاک اسی دن پوری ہو جائے آج کا کام کل پر نہ رہے کیونکہ اگلے دن
پھر دوسری ڈاک آجاتی ہے اور یہ صورت تو مختصر ہی جوابات میں ہو سکتی لیکن الحمد للہ
میرے جوابات باوجود اختصار کے کافی ہوتے ہیں کسی جزو سوال کا جواب رہ نہیں جاتا ۱۲)

اُسی طرح اس وقت گو مضمون بڑا ہے اور مختصر بیان سے شاید جی نہ بھرے لیکن انشاء اللہ تسلّی ہو جائے گی۔ یہ تو معلوم ہو چکا کہ گناہ سے بچنے کا طریقہ خدا کو یاد کرنا ہے۔ اب یہ بات رہی کہ یاد کیسے کرے تو سنئے یاد کے طریقے مختلف ہیں۔ ایک یاد ہوتی ہے محبت سے اور ایک ہوتی ہے خوف سے اور ایک ہوتی ہے حیا سے، اور ان میں بھی پھر چند قسمیں ہیں کہ محبت ذات سے ہے یا ثواب سے اور خوف ذات کا ہے یا عقاب کا (اور حیا، ذات سے ہے یا محسن کے احسان سے ۱۲) اس میں لوگوں کے طبائع اور مذاق مختلف ہیں بعضے تو وہ ہیں جن پر محبت ذات غالب ہے۔ اور صرف ذات حق کا عشق اُنکے لیے ذکر پر باعث ہے وہ نہ جنت کیلئے ذکر کرتے ہیں نہ دوزخ سے بچنے کیلئے بلکہ محض رضائے محبوب کیلئے ذکر کرتے ہیں اور یوں کہتے ہیں

؎ تو بندگی چو گدایان بشرط مزد مکن — کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

یہ تو خواص عارفین کی حالت ہے۔ اور بعضے وہ ہیں جن کو ذکر کا ولولہ اسی سے اُٹھتا ہے کہ ہم کو اس عمل سے جنت ملے گی۔ ان کے ذکر کا منشا محبت ثواب ہے سو اس کا بھی کچھ مضائقہ نہیں گو بعض عارفین نے ان پر اعتراض کیا ہے کہ یہ لوگ خواہش پرست ہیں مزدوروں کی طرح کام کرتے ہیں کہ عمل سے پہلے اُجرت ٹھہرا لیتے ہیں گویا خدا سے کہتے ہیں کہ ہم اس شرط پر ذکر کرتے ہیں کہ اس کے صلے میں ہم کو جنت دی جائے مگر یہ معترض محقق نہیں ہے میاں مقصود تو ذکر ہے وہ ہونا چاہیئے چاہے کسی طرح ہو اگر اس شخص کو طلب ثواب کی نیت سے روکا گیا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ذکر ہی سے رہ جائے گا اور اگر یہ اسی نیت سے ذکر کرتا رہا تو انشاء اللہ ایک دن وہ بھی ہوگا کہ اُسکو ذات حق سے عشق ہو جائے گا۔ پھر اسکو بھی رضائے محبوب کے سوا کچھ مطلوب نہ رہیگا۔ پس یہ حالت بھی اچھی ہے بُری نہیں دیکھو گلستان کے پڑھنے والے دو طرح کے لڑکے ہیں ایک تو وہ ہے جسکو خود گلستان میں لطف آتا ہے اور دوسرا وہ ہے جو محض باپ کے اس کہنے سے پڑھتا ہے کہ گلستاں پڑھتے رہوگے تو ہم تمکو روز ایک آنہ دیا کریں گے۔ ہر چند کہ اسکی حالت پہلے سے کم درجہ کی ہے مگر کیا کوئی عاقل اس سے یہ کہہ سکتا ہے۔ کہ میاں اگر گلستاں پڑھو تو خود ذاتی شوق سے پڑھو ورنہ ایک آنے کے لالچ سے پڑھنا فضول ہے۔ اس میں کیا فائدہ۔ ہرگز نہیں۔ کیونکہ اس کا نتیجہ بجز محرومی علم کے کچھ نہیں

بلکہ ہر شخص یہ کہے گا کہ جس طرح بھی ہو پڑھنا چاہیئے۔ اسی طرح ایک دن تم کو خود مزا آنے لگے گا پھر اُس وقت یہ حالت ہو جاویگی کہ اگر باپ کچھ بھی نہ دے۔ بلکہ یہ کہے کہ گلستاں پڑھنا چھوڑ دے تو تم ہرگز اسکی بات نہ مانوگے۔ پھر یہ قاعدہ ذکر میں کیوں نہیں جاری کیا جاتا اور جو لوگ ثواب کے لئے عمل کرتے ہیں اُن پر کیوں اعتراض کیا جاتا ہے۔ جب خدا تعالیٰ نے خود جنت کی رغبت دلائی ہے (اور اُس میں رغبت کرنے کا امر بھی کیا ہے چنانچہ ارشاد ہے وفی ذلک فلیتنافس المتنافسون۔ تو اُس کی رغبت سے ذکر کرنے میں کیا حرج ہے۔ اور جو معترض گھٹیا حالت تبلاتا ہے وہ گویا خدا تعالیٰ پر اعتراض کرتا ہے کہ اُنہوں نے گھٹیا حالت کی رغبت دلائی ہے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ حق تعالیٰ نے جتنے طریقے تبلائے ہیں سب بڑھیا ہیں اُن میں گھٹیا کوئی نہیں (یہ اور بات ہے کہ ایک رفیع ہو دوسرا ارفع پس ہر چند کہ محض رضائے محبوب کیلئے ذکر کرنا مقام ارفع ہے مگر طلب جنت کیلئے ذکر کرنا بھی رفیع حالت ہے۔ گھٹیا اور ادنیٰ حالت نہیں خوب سمجھ لو ۱۲) یہاں شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اللّٰھم انی اسئلک الجنۃ وما قرب الیھا من قول او عمل (ترجمہ) اے اللہ میں آپ سے جنت مانگتا ہوں اور پھر وہ چیز مانگتا ہوں جو جنت سے نزدیک کرنے والی ہو قول ہو یا عمل اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت کی رغبت سے عمل کرنا سب سے ارفع حالت ہے۔ کیونکہ حضور کی یہی حالت تھی تو سمجھ لیجئے کہ ارفع تو وہی حالت ہے کہ محض رضائے محبوب کیلئے عمل کیا جائے رہا حضور کا جنت مانگنا سو اس کے متعلق وہ بات یاد کر لیجئے جو میں نے پہلے بیان کی ہے کہ عاشق کو محبوب کی چیزوں سے بھی محبت ہوا کرتی ہے۔ پس آپ کا جنت مانگنا ویسا نہیں تھا ہے جیسا ہمارا مانگنا ہے۔ ہم تو جنت اس لئے مانگتے ہیں کہ وہاں ہم کو آرام ملے گا حوریں ملیں گی خوب مزے اُڑیں گے۔ غرض ہم کو حظ نفس مطلوب ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جنت مانگنا اس بنا پر تھا کہ وہ خدا کی چیز ہے اور خدا تعالیٰ نے اُس کے مانگنے کا امر فرمایا ہے جب محبوب خود چاہے کہ مجھ سے میری چیزیں بھی مانگو تو اُس وقت مانگنا ہی موجب رضا ہے اُس وقت استغنا مناسب نہیں ؎

چوں طمع خواہد زمن سلطان دین خاک بر فرق قناعت بعد ازیں

اس لئے آپ نے جنت مانگی اور اس سے استغنار نہیں برزا عارف کامل خدا تعالیٰ کی ادنیٰ نعمت سے بھی استغنار ظاہر نہیں کر سکتا چہ جائے کہ جنت سے جو کہ اجلّ النعم ہے۔ ہاں کوئی ابن الفارض جیسا صاحب حال ہو تو وہ بلا سے استغنا ظاہر کر دے اور ایسے لوگ غلبہ حال سے معذور ہوں گے ورنہ معرفت کا مقتضا یہی ہے کہ جیسے محبوب سے رضائے محبوب طلب کیجاتی ہے۔ اسی طرح اور جس چیز کا مانگنا اُسے پسند ہو وہ بھی مانگے اور یہ بھی درحقیقت طلب رضا ہی ہے۔ کسی دوسری چیز کی طلب نہیں۔ دوسرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم جنت کا سوال اس بنا پر بھی کرتے تھے کہ وہ محل دیدار ہے تو درحقیقت یہ جنت کا سوال نہ تھا۔ بلکہ دیدارِ محبوب کا سوال تھا اسی کو کہتے ہیں ؎ عاشقان جنت برائے دوست می دارند دوست۔ اور ایک بات اس سے بھی باریک ہے وہ یہ کہ بعض دفعہ جنت کی طلب اس نیت سے بھی نہیں ہوتی کہ وہاں محبوب کا دیدار ہوگا بلکہ محض اس خیال سے تمنا کی جاتی ہے کہ ہماری یہ شان تو کہاں جو دیدار کی تمنا کریں۔ تو اگر جائے دیدار ہی کو دیکھ لیں تو بڑی قسمت ہے ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ وہ لوگ بڑے حوصلے کے ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھنے کی تمنا کرتے ہیں۔ ہم تو اپنے کو اس قابل بھی نہیں سمجھتے کہ قبۂ خضرا ہی ہمیں نظر آجائے ؎

مرا از زلف تو موئے بسند است ہوس را رہ مدہ بوئے بسند است

تو بعض دفعہ غلبۂ تواضع طلب جنت کا منشا ہوتا ہے کہ عاشق اپنے کو وصال محبوب کے قابل نہیں سمجھتا اسلئے تمنا کرتا ہے کہ میں اُسکو دیکھنے کے تو لائق نہیں کاش اُسکے شہر ہی میں جا رہوں اور کبھی اپنی احتیاج و افتقار ظاہر کرنے کے لئے جنت کی تمنا کیجاتی ہے کہ اے اللہ میں آپ کی رضا کا محتاج تو کیوں نہوں گا میں تو جنت تک بھی محتاج ہوں اسلئے بطور اظہارِ احتیاج کے دعا کیجاتی ہے کہ اے اللہ جنت دیدے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حال پیشِ نظر ہوتا تو آپ کھانا کھا کر فرمایا کرتے تھے الحمد للہ الذی اطعمنا وسقانا وجعلنا من المسلمین غیر مودع ولا مکفور ولا مستغنی عنه ربنا۔ یعنی اے اللہ اس وقت پیٹ بھر گیا ہے۔ اسلئے کھانے کو اٹھا دیا ہے۔ ہم اسکو ہمیشہ کے لئے وداع نہیں کرتے نہ اس کی ناقدری کرتے ہیں اور نہ

اے اللہ ہمیں اس سے استغنا ہے۔ حقیقت میں آپ کی اداؤں کی یہ حالت ہے کہ۔ ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

آپکی جس ادا کو بھی دیکھو اُس میں غضب کی دلربائی ہے۔ پھر کمال یہ کہ اُس میں نہ تصنع نہ تکلیف بلکہ ایک بیساختہ حال ہے۔ ؎

دلفریباں نباتی ہمہ زیور بستند
دلبر ماست کہ با حُسنِ خدا داد آمد

مخالفین نے بھی اِن باتوں کو دیکھکر آپکی سچائی کی شہادت دی۔ اور اُن کو ماننا پڑا کہ حضور میں جس قدر کمالات تھے وہ اصلی ہی تھی تصنع اور بناوٹ کا وہاں نام نہ تھا۔ غرض ایک بنی طلب جنت کا یہ بھی ہوتا ہے۔ یعنی اظہارِ احتیاج پس حضور کا جنت مانگنا اور ہمارا مانگنا برابر نہیں (اور آپکے سوال جنت کا یہ مطلب نہیں کہ عمل جنت کے واسطے کرنا چاہیئے بلکہ اس کا جو منشا آپکی شان کے مناسب تھا وہ اپنے علم کے موافق عرض کر دیا گیا ۱۲) لیکن اگر کوئی شخص جنت ملنے ہی کی نیت سے عمل کرے۔ تو وہ بھی راہ صواب پر ہے غلط راستے پر نہیں خدا تعالیٰ سے محبت ہونی چاہیئے خواہ بلا واسطہ براہ راست ہو یا جنت کے واسطے سے ہو سب ٹھیک ہے

بخت اگر مدد کند دامنش آورم بکف
گر بکشد زہے طرب ور بکشم زہے شرف

یعنی مقصود قرب ہے بس قرب ہونا چاہیئے خواہ میں اُنہیں کھینچ لوں یا وہ مجھے کھینچ لیں۔ اسی طرح یہاں سمجھو کہ مقصود تو کام چلنا ہے کہ بندہ کو خدا کی اطاعت و ذکر کی توفیق ہو جائے اب وہ براہ راست خدا کی محبت سے ہوا تو کیا اور جنت کی رغبت سے ہوا تو کیا دونوں راستے ٹھیک ہیں (اور دونوں بڑھیا ہیں گو ایک رفیع ہے اور ایک ارفع ۱۲) یہ تو محبت کی قسمیں تھیں اسی طرح خوف کی بھی مختلف صورتیں ہیں کسی کو ذاتِ حق سے خوف ہے۔ بوجہ اُس کی عظمت و جلالت شان کے۔ اور کسی کو عذاب کا خوف ہے۔ یہ دونوں راستے بھی ٹھیک ہیں کیونکہ حق تعالیٰ نے اپنے عذاب و عقاب سے بندوں کو ڈرایا ہے اور اُس کی شدت جابجا اسی لئے بیان فرمائی ہے کہ بعض طبائع پر جلالت و عظمت حق کا انکشاف نہیں ہوتا اُنکے لئے خوفِ عذاب ہی گناہوں سے زاجر ہوتا ہے پس جو لوگ خوف عذاب سے عمل کرتے ہیں اُن پر بھی اعتراض نہ چاہیئے اُن کی حالت بھی گھٹیا نہیں (بلکہ رفیع حالت ہے گو اس سے ارفع

یہ حالت ہے کہ عظمت و جلالت شان خالق منکشف ہو کر گناہوں سے زاجر ہو ۱۲) یاد کی دو قسمیں تو یہ ہوئیں۔ ایک یاد محبت۔ ایک یاد خوف۔ ایک تیسری قسم اور ہے یاد حیار بعض وہ طبائع ہیں جو ذکر اللہ اور اعمال صالحہ محض حیار کی وجہ سے کرتے ہیں اُن کو اپنے خالق محبوب کی یاد سے غافل ہوتے ہوئے شرم و حیار آتی ہے۔ خوف یا محبّت اُن کے لئے ذکر و طاعت کا قوی باعث نہیں ہوتا بلکہ وہ محض حیار کی وجہ سے سب کچھ کرتے ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ حضرات خوف و محبت سے خالی ہوتے ہیں یہ نہیں بلکہ ان کا غلبہ نہیں ہوتا غلبۂ حیار کو ہوتا ہے۔ باقی خوف و محبت و حیار کسی سے بھی کوئی مسلمان خالی نہیں ہو سکتا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ہر مسلمان میں ان کا موجود ہے ہاں غلبہ کسی پر خوف کا ہے کسی پر محبّت کا کسی پر حیار کا۔ اور جس صفت کا جس میں غلبہ ہے وہی اُس کے لئے اعمال کی طرف داعی ہوتی ہے۔ کسی میں حیار غالب ہے۔ تو یہی حیار اُس کے لئے ذکر اللہ کا باعث ہوتی ہے۔ یہ راستہ بھی ٹھیک ہے۔ (خدا تعالیٰ نے جس کے لئے جو راستہ مناسب سمجھا مقرر کر دیا۔ بندگی کے معنے یہ ہیں کہ اُسی پر راضی رہے اور اُس کے خلاف کی تمنّا نہ کرے۔ امور غیر اختیاریہ موہوبہ غیر مکتسبہ میں خلاف کی تمنّا مذموم ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے ولا تتمنوا ما فضل اللہ بہ بعضکم علے بعض ۱۲) پس اے سالکین جب تم کو معلوم ہو گیا کہ ذکر کی اتنی صورتیں ہیں اور یہ سب وصول الی المقصود کے لئے کافی ہیں تو ذکر و شغل کرکے اُس کے متمنی نہ ہوا کرو کہ کاش ہم کو خوف حاصل ہو جاتا اور جب عرصہ تک ذکر کرکے وہ حاصل نہوا تو افسوس کرنے لگے کہ ہائے ہم پر خوف غالب کیوں نہیں ہوتا۔ صاحب تم کو کیا خبر ہے کہ تمہارے لئے خوف کا راستہ مناسب ہے یا محبت و حیار کا۔ یہ تو سرکاری تقسیم ہے۔ جس کے مناسب جو راستہ معلوم ہوا اُسی کے اسباب اُس میں پیدا کر دیئے وہ کسی کو ہنسا کر پہونچاتے ہیں کسی کو رولا کر۔ اور کسی کو نہ ہنساتے ہیں نہ رولاتے ہیں اُسکو حیرت و پریشانی میں رکھکر پہونچاتے ہیں۔ خوب کہا ہے۔ ؎

بگوش گل چہ سخن گفتہ کہ خنداں است ۔۔۔ بعندلیب چہ فرمودۂ کہ نالاں است

مولانا فرماتے ہیں۔ ؎

؎ گر بعلم آئیم ما ایوان اوست ۔۔۔ ور بجہل آئیم ما زندان اوست
گر بخواب آئیم مستان وئیم ۔۔۔ ور بہ بیداری بدستان وئیم

اور حیرت کا بیان فرماتے ہیں ؎

در تردد ہر کہ او آشفتہ ہست ۔۔۔ حق بگوشِ او معما گفتہ است

اور فرماتے ہیں ؎

گہ چنیں بنماید و گہ ضد این ۔۔۔ جُز کہ حیرانی نباشد کار دین

غرض کسی کو کچھ دیا کسی کو کچھ دیا جسکو محبوب کے ہاتھ سے جو بھی مل گیا اُسی کو سب سے اچھا سمجھنا چاہیئے۔ اور اُس پر راضی رہکر یہ شان ہونی چاہیئے ؎

من چو کلکم درمیان اصبعین ۔۔۔ نیستم در صفِ طاعت بین بین

یعنی جس طرح قلم کاتب کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ کہ وہ جو کچھ لکھنا چاہتا ہے وہی لکھا جاتا ہے اگر عربی لکھنا چاہے تو قلم سے عربی ہی لکھی جاتی ہے۔ اگر اُردو لکھنی چاہے تو اُردو ہی لکھی جاتی ہے۔ اسی طرح تم بھی خدا تعالےٰ کے تقسیم کے سامنے مطیع و منقاد ہو جاؤ۔ چنانچہ جنہوں نے اس کو سمجھ لیا ہے وہ ہر حال میں راضی رہتے ہیں۔ اگر اُن پر محبت کا غلبہ ہے۔ تو غلبہ خوف کے طالب نہیں ہوتے۔ اگر خوف کا غلبہ ہے تو غلبۂ محبت کے طالب نہیں ہوتے وہ تو ہر حال میں یہ کہتے ہیں ؎

بدُرد و صاف ترا حکم نیست دم درکش ۔۔۔ کہ انچہ ساقیٔ ما ریخت عین الطاف است

یہ بات ذاکرین کے کام کی ہے کیونکہ اُن کو بڑی حرص ہوتی ہے اُن میں حالات و کیفیات و مقامات کی تمنّا کا مرض بہت ہے۔ یاد رکھو یہ خلاف عبدیت ہے بعض ذاکرین ذکر کرکے یہ شکایت کرتے ہیں کہ مزا نہیں آتا ہائے یہ ساری عمر نفس کے مزے ہی میں پڑے رہیں گے محبوب کی طرف کب متوجہ ہوں گے۔ حضرت منصور نے ایک سالک سے پوچھا کہ آج کل کس کام میں ہو۔ انہوں نے کہا کہ مقام توکل طے کر رہا ہوں منصور نے کہا افسوس تم ساری عمر پیٹ ہی کے دھندے میں رہو گے محبوب کے ساتھ کب مشغول ہوگے (کیونکہ واقعی توکل تو اکثر کھانے پینے اور پہننے ہی کے فکر سے چھوٹ جانے کے لئے کیا جاتا ہے تو

یہ بھی پیٹ ہی کا دھندا ہوا ۱۲) یاد رکھو عاشق کا مذہب یہ ہونا چاہیئے ؎

عشق آں شعلہ است کو چوں بر فروخت ۔ ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

تیغ لا در قتل غیر حق براند ۔ در نگر آخر کہ بعد لا چہ ماند

ماند الا اللہ و باقی جملہ رفت ۔ مرحبا ای عشق شرکت سوز رفت

جب لا الٰہ الا اللہ کہدیا تو اللہ تعالیٰ کے سوا سب منفی ہو گئے پس اب نہ کسی خاص کیفیت کے طالب بنو نہ کسی خاص مقام کے۔ بلکہ خدا کے طالب بنو۔ اور اگر کچھ بھی نہ ملے تب بھی راضی رہو۔ ؎

گر مرادت را مذاق شکر است ۔ بے مرادی نے مراد دلبر است

یعنی ہم نے مانا کہ تمہاری مراد بہت عمدہ ہے۔ مگر یہ تو سوچو کہ اگر دلبر کی مراد یہ ہے۔ کہ تم نامراد رہو تو کیا اُسکی مراد تمہاری مراد سے افضل نہ ہوگی۔ یقیناً ہوگی اس جگہ نامرادی کا مطلب اور کچھ نہ ملنے کے معنے یہ ہیں کہ تمہاری مخترعات اور مستحسنات نہ ملیں یہ مطلب نہیں ہے کہ بالکل کچھ نہ ملے کچھ تو ضرور ملتا ہے۔ اگر تمہارے مخترعات نہ ملیں گی تو وہ خود تم کو ملیں گے۔ اور جب وہ مل گئے پھر تو سب کچھ مل گیا ؎

آنکس کہ ترا شناخت جاں را چہ کند ۔ فرزند و عیال و خانماں را چہ کند

پس بندے کا کام یہ ہے کہ خدا کی یاد میں لگے اور ذکر و فکر ہی کو مقصود سمجھے اور کسی کیفیت پر نظر نہ رکھے۔ کیونکہ میں نے بتلا دیا ہے۔ کہ ذکر کی مختلف صورتیں ہیں اور ذکر اُن سب کو عام ہے۔ اب میں گناہوں سے بچنے کی ایک بہت آسان تدبیر بتلاتا ہوں جس پر ہر شخص کو عمل کرنا آسان ہو وہ یہ کہ گناہ تو خیر ہم سے بہت ہوتے ہی ہیں اور سب کا دفعتہً چھوٹ جانا ہر شخص سے آسان بھی نہیں مگر تم یہ کیا کرو کہ ایک وقت تنہائی کا مقرر کر لو اور اُس میں خدا کی یاد کیا کرو مگر یاد ایسی ہو کہ زبان و دل دونوں اُس میں شریک ہوں ورنہ وہ حالت ہوگی ؎

سبحہ بر کف توبہ بر لب دل پر از ذوق گناہ ۔ معصیت را خندہ می آید بر استغفار ما

اور ایسی زبانی یاد جلدی مؤثر نہیں ہوتی یادِ خدا وہی جلدی رنگ لاتی ہے جو دل و زبان

دونوں سے ہو تو صاحب میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ دن بھر کوئی گناہ نہ کرو میں کہتا ہوں کہ اگر تم سے گناہ چھوٹ ہی نہیں سکتے تو خدا کے لئے اتنا تو کرو کہ ایک وقت گھنٹہ آدھ گھنٹہ یاد خدا کے واسطے مقرر کر لو لیکن جب اللہ کا نام لینے بیٹھو تو قصداً دل میں کچھ نہ لاؤ اور جو خود آجاوے اُسے آنے دو وہ تم کو کچھ مضر نہیں دیکھو اگر ایک سرکاری آدمی پہرہ پر کھڑا کیا گیا ہو کہ دربار میں کسی باغی کو نہ آنے دے تو اگر وہ سنتری خود ہی باغی کو اندر لیلے تو مجرم ہوگا لیکن اگر وہ خود اندر نہ لے بلکہ باغی اسکو مجبور کرے اور اُسکے ہاتھ پاؤں باندھ کر زبردستی اندر چلا آوے تو سنتری مجرم نہ ہوگا۔ اسی طرح نماز یا ذکر میں خود وساوس کا لانا یا اُدھر مشغول ہو جانا بُرا ہے۔ اور اگر خود نہ لاؤ اور نہ اُدھر متوجہ ہو تو کچھ ضرر نہیں پس تم اپنے مایہ و متاع کو خود ذہن میں نہ لاؤ بلکہ اپنی طرف سے تو اُس کی کوشش کرو ؎

بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روئے — بہ ازاں کہ چتر شاہی ہمہ روز ہائے ہوئے

صاحبو! ایک گھنٹہ تو ایسا نکالو جس میں اس طرح خدا کی یاد کیا کرو۔ آگے ایک تجربے کی بات ہے کہ اس وقت جتنا مفرد اور بسیط ذکر ہوگا اتنا ہی یکسوئی زیادہ ہوگی۔ اور وہی زیادہ مفید ہوگا۔ پس اس ایک گھنٹے میں دل لگا کر لا الہ الا اللہ کا ذکر کرو یا اللہ اللہ کا اور اُس وقت اپنی طرف سے خدا کی طرف متوجہ رہنے کی پوری کوشش کرو۔ بس تم اس طرح روزانہ ایک گھنٹہ پورا کر دیا کرو۔ اس کے بعد چاہے جس حال میں بھی تمہاری گزرے۔ میں دکھلا دوں گا کہ چند روز کے بعد عین گناہ کے وقت شرم آوے گی۔ اور گناہ کرتے ہوئے اندر سے کوئی چیز تم کو روکے گی۔ اگر اُس وقت تم نے اس شرم و حیاء سے کام لیا۔ اور فائدہ اُٹھایا تو مدعا حاصل ہوا اور اگر نفس و شیطان سے مغلوب ہو کر گناہ کر بھی لیا۔ تو فوراً دل کے نور میں کمی معلوم ہوگی جس سے گھبرا کر معاً توبہ کی طرف جُھکو گے اور اگلے دن اس حرکت کے بعد خدا کا نام لیتے ہوئے نہایت شرم آویگی اور سخت صدمہ ہوگا۔ اور کیا کہوں کیا کیا باتیں آسکے گا۔ آپ ورد کو پورا کرنا چاہیں گے اور گناہ کا خیال آیگی زبان پکڑ لیگا بس وہ حال ہوگا ؎

احب مناجاۃ الحبیب باوجہ — ولکن لسان المذنبین کلیل

حضرات میں آپ کو عجیب بات بتلا رہا ہوں بجز ذکر کی پابندی کے ساتھ اول تو آپ سے گناہ ہی نہیں صادر ہو سکتے اور اگر ہوئے بھی تو اس حالت سے ہونگے کہ بعد میں دل پر آرے چلیں گے جس سے انشاء اللہ یہ اثر ہوگا کہ ایک ایک کرکے سب گناہ چھوٹ جائیں گے اور جس وقت کوئی لغزش ہوگی فوراً دل پر نشتر سا لگے گا اور توبہ کی توفیق ہوگی بدون توبہ کے چین ہی نہ آئے گا۔ جانئے میں نے اتنا سہل نسخہ بتلا دیا جس سے زیادہ آسان کوئی نسخہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر کسی سے یہ تدبیر بھی نہ ہو سکے تو انا للہ و انا الیہ راجعون ۔ بس اُس کے لئے یہ کہا جاوے گا ؎

اُسکے الطاف تو ہیں عام شہیدی سب پر — تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

خلاصہ وعظ کا یہ ہوا کہ اس آیت میں اولئک ھم الفاسقون کو۔ نسوا اللہ ۔ پر مرتب کیا گیا ہے جس سے اس نسیان کا سبب فسق و معصیت ہونا ظاہر ہوا اور مرض کا ازالہ سبب کے ازالہ سے ہوتا ہے۔ تو معصیت کا علاج ازالۂ نسیان ہوا اور ازالۂ نسیان ذکر سے ہوتا ہے اسلئے گناہوں سے بچنے کے واسطے ذکر اللہ لازم ہوا جس کی سہل تدبیر میں نے بتلا دی الحمد للہ اس آیت سے یہ عجیب مسئلہ نہایت آسانی سے مستنبط ہو گیا۔ اب میں ختم کرتا ہوں خدا تعالیٰ اسکو مقبول فرما دیں اور آپ کو اس کا نفع عنایت فرمائیں آمین وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا و مولانا محمد و علی آلہ و اصحابہ اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین ۔ فقط

تمت

حکیم الامۃ محی السنۃ حضرت علامہ مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب مدظلہم العالی کے مضامین کا خزینہ

علمی اور مذہبی

الہادی

ماہواری رسالہ

علوم دینیہ کے شائقین کو مژدہ ہو کہ مواعظ حسنہ اور حدیث و تصوف اور علوم عقلیہ کا جامع رسالہ جمادی الاول ۱۳۴۱ھ سے جاری ہوا ہے جس میں مضامین ذیل ہوتے ہیں:-

الترغیب والترہیب - ترجمہ ترغیب و ترہیب جس میں صحیح احادیث سے اعمال کی فضیلت اور گناہوں کی مذمت مفصل بیان کی گئی ہے جس کو سن کر یا دیکھ کر ہر انسان کا دل طاعت کی جانب مائل ہوتا ہے اور گناہوں کو چھوڑ دیتا ہے۔

تسہیل المواعظ - جس میں حکیم الامۃ حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب مدظلہم کے مواعظ حسنہ کو ایسا آسان کر دیا ہے کہ ہر شخص بخوبی سمجھ سکتا ہے۔

المصالح العقلیہ للاحکام النقلیہ جلد دوم جس میں حضرت مولانا موصوف دام فیضہم نے احکام شرعیہ کی حکمتیں بیان فرمائی ہیں جس کا مطالعہ تمام مسلمانوں کو عموماً اور تعلیم یافتہ حضرات کو خصوصاً نہایت ضروری اور بیحد مفید ہے۔

کلید مثنوی شرح مثنوی مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ - اس کے متعلق تو کچھ کہنے کی حاجت ہی نہیں جو حصے اس کے چھپ چکے ہیں وہ اس کی شان ظاہر کرنے کیلئے کافی ہیں۔

التشرف بمعرفۃ احادیث التصوف جس میں مولانا مدظلہم نے ان احادیث کی تحقیق فرمائی ہے جو السنۃ صوفیہ پر یا رسائل تصوف میں مذکور ہیں یہ کتاب نہایت شاندار ہے۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ رسالہ ہذا کیلئے حضرت والا نے اس کا ترجمہ فرما دیا جس میں مسائل تصوف کی تقریر بھی کی گئی ہے۔ جو لوگ مولانا مدظلہم کی تحقیق تصوف سے واقف ہیں وہ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس عظیم کتاب میں کیا کچھ بیش بہا جواہرات علمیہ ہوں گے۔

باوجود ان سب خوبیوں کے قیمت سالانہ صرف دو روپے آٹھ آنے (عہ)

المشتہر:- محمد عثمان مالک کتب خانہ اشرفیہ دریبہ کلاں دہلی